کتاب و سنت اور اسلافِ اُمت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد حیدرآباد

Volume:15 Issue:2 Februrary 2022

مدیر

مولانا محمد عبد القوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

درسِ قرآن	شراب نوشی مسلم سماج کے لئے لعنت ہے	مولانا محمد عبد القادر فرید قاسمی	۵
درسِ حدیث	امام ذمہ دار اور موذن امین ہے	مرتب	۷
پیش گفتار	دینی مدارس میں عصری تعلیم	مدیر	۹
گوشۂ سیرت	کیا تم میرے دوست کو ستانا نہیں چھوڑو گے!	مولانا الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی	۲۸
گوشۂ خواتین	اسلام کی باکمال خواتین	مولانا مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی	۲۹
"	اُم ابراھیم حضرت ماریہ قبطیہؓ	مولانا سراج احمد قاسمی زید مجدہٗ	۳۳
اصلاحی مضامین	القاب کا استعمال اور ہماری بے اعتدالیاں	مفتی محمد ندیم الدین قاسمی	۴۰
"	روحانی انفیکشن اور روحانی اینٹی بایوٹک	مولانا محمد اللہ قیصر قاسمی	۴۳
"	ماہ رجب کی مذہبی و تاریخی اہمیت	مفتی محمد ظل الرحمن قاسمی	۴۵
فقہ وفتاویٰ	آپ کے شرعی مسائل	مفتی محمد ندیم الدین قاسمی	۴۹

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن

شراب نوشی مسلم سماج کے لئے لعنت ہے

از: مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۹۰ (سورۃ المائدہ)

ترجمہ: اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جُوّے کے تیر یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں ،لہذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

توضیح: شریعت کا مزاج یہ ہے کہ اس نے جس قول وعمل کو رجس من عمل الشیطان اور سبب مضرت محسوس کیا اس سے اجتناب کا حکم دیا اور جس گفتار وکردار کو مرضی حق اور سبب منفعت دیکھا اس کے اختیار کا امر جاری فرمایا، پھر انسانی شعور کو اس بات کی طاقت دی کہ وہ رجس ومعصیت اور اس کے اضداد میں فرق محسوس کرے، اور اپنے وجدان سے دوراہوں میں سے ایک راہ کو پسند کرے، اسی کا نام ابتلاء وآزمائش ہے اور یہی مقصد حیات بھی ہے؛ لیکن عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان اپنی فطرت سلیمہ کو ترک کر کے اپنی نفسانی وشہوانی قوت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کئی چیزیں معاشرے کے لیے ناسور اور اخلاقی بگاڑ کا ذریعہ بنتی ہیں جس سے معاشرے پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں، انھی میں سے ایک شراب نوشی بھی ہے، شراب کو ام الخبائث کہا گیا ہے، اس کی لت نہ صرف انسان کی جسمانی وذہنی صحت کو متاثر کرتی ہے بلکہ اس کے اخلاق وکردار اور قوت فیصلے کو بھی کمزور بنا دیتی ہے، شراب نوشی کرنے والا نہ صرف اپنے خاندان کے لیے بوجھ ہوتا ہے بلکہ وہ پورے سماج کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے شراب نوشی کی حرمت کو بتدریج نازل فرمایا، کہیں لوگوں کے سوال کرنے پر جواب نازل ہوا کہ شراب نوشی میں کچھ فائدہ تو ہے لیکن اس کے مضرات زیادہ ہیں، کہیں شراب نوشی کے ذریعے

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، حیدرآباد

پیدا ہونے والے عقلی فتور اس کی نجاست و دنائت کے پیش نظر حکم صادر فرمایا کہ تم شراب پی کر ہماری بارگاہ میں مت آنا، یہ شریعت کی حکمت بالغہ اور تربیت کا عدیم المثال انداز ہے کہ جس دور میں شراب نوشی کی کثرت تھی اور شراب سے انسیت اس قدر تھی کہ عنوان شراب پر اشعار بھی پڑھے جاتے اور فخر و مباھات بھی کیا جاتا، ایسے دور میں یک لخت حرمت شراب کا حکم آتا تو بوجھ بن جاتا؛ چنانچہ ذہن سازی کے بعد اب تیسری مرتبہ حکم ملا کہ شراب نوشی شیطان کے ناپاک اعمال میں سے ہے، لہذا اس سے اجتناب کرو، پھر بعد والی آیت کے اخیر میں یہ سوال کیا گیا کیا تم باز آنے والے ہو؟ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں اس مجلس میں موجود تھا، نبی پاک ﷺ کی زبانی یہ آیت سنی، اٹھا، شراب نوشی کی محفل میں گیا، لوگوں کے ہاتھوں میں جام و مینا تھے، یہ دو آیات پڑھ کر سنائی، چشم فلک نے تسلیم و رضا کا نادر جذبہ دیکھا کہ ہاتھ سے پیالے چھوٹ گئے، مٹکے پھوڑ دیے گئے، شراب کے برتن انڈیل دیے گئے، اس طرح تعمیل حکم کا عملی نمونہ پیش کر کے اپنے رب سے کہنے لگے: اے ہمارے رب! ہم باز آ گئے۔

خود نبی پاک ﷺ کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں شراب نوشی پر سخت مذمت فرمائی گئی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: شراب پیتے وقت شرابی میں ایمان کامل نہیں رہتا، جس نے دنیا میں شراب پی وہ آخرت کے شراب طہور سے محروم رہے گا، جس نے شراب پی اس کی چالیس روز تک توبہ قبول نہیں ہوگی، شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہو پائے گا، ہر وہ شے جو عقل کو ڈھانپ لے وہ شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے، میری امت میں جو شراب پیئے گا چالیس روز تک اس کی نمازیں قبول نہیں ہوں گیں، شراب پینے والا ایسا مجرم ہے جیسے بت کو پوجنے والا، شراب پینے والا ایسا ہے جیسے لات و عزا کی پرستش کرنے والا۔

آج مسلم معاشرے کو مخرب اخلاق چیزوں کا گھن لگتا جا رہا ہے، جن میں سے ایک منشیات کی عادت بھی ہے، پہلے دور میں اکثر ناخواندہ غیر شریف لوگوں کا وتیرہ ہوا کرتا تھا، اب نت نئ قسم کی منشیات بازار میں آ چکی ہیں؛ جس کی زد میں شریف اور تعلیم یافتہ طبقہ بھی آتا جا رہا ہے، زمانہ تعلیم و ترقی میں جس برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اسی قدر اخلاقی انحطاط میں پست تر ہوتا جا رہا ہے، یہ دور ہر صاحب علم و دانش کے لیے لمحہ فکریہ اور ہر سرپرست اور راعی کے لیے قوت گرفت مضبوط کرنے، اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنے اور ایک صحت مند معاشرہ بنانے کی فکر کرنے کا ہے، اور یہ مقام غور و فکر ہے کہ مذہب کی نشر و اشاعت معاشرہ کی جس نوجوان نسل کے کاندھوں پر ہے وہی ان عادتوں میں پڑ کر نحیف و کمزور پڑ جائے تو کیا خاک مذہب کی حفاظت و دفاعی خدمت کی اُن سے توقع کی جائے گی۔؟

امام ذمہ دار اور مؤذن امین ہے

از: مرتب

عَنْ اَبی هُرَیْرَة رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وسلم! الاِمامِ ضَامِنٌ وَالمؤذِنُ مُؤتمنٌ اللّٰهُمَّ اَرْشِدِ الأئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلمُؤَذِنِین (رواہ ابوداؤد: 517)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: امام (قوم کی نماز کا) ذمہ دار ہے، اور مؤذن امانت دار ہے، (پھر ان کے لئے دعا فرمائی) اے اللہ! امام کی راہ نمائی فرما، اور مؤذن کی بخشش فرما۔

تشریح: نماز افضل الاعمال، اھم العبادات ہے، اس کی ادائیگی کے لئے شریعت نے امت مسلمہ کو بہت سے احکامات کا پابند کیا ہے، فریضۂ نماز کی ادائیگی اور قبولیت کے لئے جیسے طہارت و پاکی، اوقاتِ مستحبہ، قرآتِ قرآن، شرائط وآداب، خشوع وخضوع کے اہتمام کی ضرورت ہے، ایسے ہی مردوں کو نماز باجماعت ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی شرعی مقصد کو پورا کرنے کے لئے اوقات کا تحفظ، مساجد کا قیام، اذان کا اہتمام، ائمہ کا انتظام ہمیشہ سے الحمدللہ امت کے پیش نظر رہا ہے۔

نماز باجماعت والے عمل میں امام وموذن کا بڑا کردار ہوتا ہے، کہ موذن وقت پر اذان دے کر قوم وملت کو اوقات صلوٰۃ کی اطلاع اور اس کی ادائیگی کی دعوت دیتا ہے، تو امام حاضرین مسجد ومصلیان کرام کو اپنی ذمہ داری سے نماز پڑھاتا ہے، احادیث مبارکہ میں امام وموذن کے فضائل ومناقب کے ساتھ انھیں یہ بھی بتلایا گیا کہ کیسے اپنے مفوضہ امور کو انجام دینا ہے۔

مذکورہ حدیث میں امام کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ ''ضامن'' ذمہ دار ہے، یعنی اپنی نماز کے ساتھ مقتدیوں کی نماز کا ذمہ دار بھی ہے، اپنی دعاؤں میں مقتدیوں کو بھی شامل رکھے، مقتدیوں کی نماز کی امام کی نماز سے مقبول بھی ہوتی ہے اور مردود بھی۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو ہدایت دی کہ ''تم میں جو اچھے اور بہتر ہوں ان کو

اپنا امام بناؤ، کیوں کہ وہ تمہارے رب اور مالک کے حضور میں تمہارے نمائندے ہیں‘‘۔اور امام کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ ’’جو شخص جماعت کی امامت کرے اُس کو چاہیئے کہ خدا سے ڈرے اور یقین رکھے کہ وہ (مقتدیوں کی نماز کا بھی) ضامن یعنی ذمہ دار ہے، اُس سے اس ذمہ داری کے بارے میں سوال ہوگا، اگر اس نے اچھی نماز پڑھائی تو پیچھے نماز پڑھنے والے سب مقتدیوں کے مجموعی ثواب کے برابر اس کو ثواب ملے گا، مقتدیوں کے ثواب میں کمی کئے بغیر اور نماز میں جو نقص اور قصور ہوگا اس کا بوجھ تنہا امام پر ہوگا۔

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام متقی اور پرہیز گار ہو، نماز کے مسائل، احکام وآداب سے خوب واقف ہو، تلاوت عمدہ لحن میں کرتا ہو، صفوں کی ترتیب میں ہونے والی کوتاہیوں کو درست کرتا ہو، نمازیوں میں کوئی منکر دیکھے تو اس کی اصلاح کرتا ہو، اوقاتِ مستحبہ کی رعایت رکھتا ہو، نماز نہ اتنی طویل پڑھاتا ہو کہ مقتدی بے زار ہوجائیں، نہ اتنی مختصر کہ مقتدیوں کی جماعت فوت ہوجائے ۔یعنی اس کی نماز ایسی معتدل ہو کہ جس میں بیماروں، بوڑھوں، کم زوروں، ضرورت مندوں سب کی رعایت کی گئی ہو۔

کسی شخص نے کہا کہ فلاں امام کی طویل نماز کی وجہ سے میں صبح کی نماز میں شریک نہیں ہوتا ہوں تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سخت ناراض ہوئے فرمایا: ’’ان منکم منفرین‘‘ تم میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو (اپنے غلط طرز عمل سے اللہ کے بندوں کو) دور بھگانے والے ہیں۔

الحاصل ! مساجد کے ائمہ اگر علماء ہیں وہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اگر صرف حفاظ کرام ہیں تو وہ منصب امامت کے فرائض بہ حسن وخوبی اس وقت انجام دے سکتے ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی امامت کا اسوہ سامنے ہوگا۔

حدیث میں موذن کے بارے میں فرمایا کہ وہ ’’امین‘‘ ہے، یعنی لوگوں کو اوقاتِ نماز اور رمضان المبارک میں اوقاتِ سحر وافطار میں اُس پر اعتماد ہوتا ہے، وہ اس اعتماد کو نہ توڑے، امانت داری کے ساتھ وقت ہونے کے بعد ہی اذان دے ، نیند میں یا جلد بازی میں وقت سے پہلے یا بے طہارت اذان نہ دے اور سحر وافطار کا اعلانات میں عجلت نہ کرے ، وقت ہوجانے کا مکمل اطمینان کرلیں اور ایسی خوش آوازی وبلند صوتی سے اذان دے کہ لوگوں کے دل نماز کے لئے راغب ہوجائیں۔کبھی بلند مینارے یا مسجد کی چھت پر سے اذان دینے کی نوبت آئے تو آس پاس کے مکانات پر نظریں نہ ڈالے، کیوں کہ موذن امین ہے، ان اُمور میں کوتاہی اور غفلت سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔

ائمہ ہوں کہ مؤذنین، دونوں سے غلطی ہوسکتی ہے، سلام ہو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کہ آپ نے دونوں کے حق میں دعائیہ جملے ارشاد فرمائے، کہ اے اللہ! ائمہ کی راہ نمائی فرما،۔۔۔۔(بقیہ صفحہ: ۲۷ پر)

دینی مدارس میں عصری تعلیم

از: مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ وبہ نستعین

پہلے کے حالات اور تقاضے

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مدارس دینیہ میں زیر تعلیم طلبہ کے لئے فنی وعصری تعلیم کا مطالبہ بہت عرصے سے اہلِ مدارس کے سامنے آرہا ہے، یہ مطالبہ یا تو عصری تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے سامنے آتا تھا جن کی نظر میں تعلیم کا مقصد اچھی روزی کا حصول اور خوش معاشی ہوتا ہے، جس سے وہ دینی علم کے حاملین کو محروم یا اپنی آمدنی پر بوجھ سمجھتے تھے، اس لئے انہیں خود مکتفی ہونے کے راستے دکھاتے رہتے تھے، یا پھر وہ طبقہ اس کی بلند بانگ وکالت کرتا رہا جس کو مدارسِ دینیہ سے فراغت پر قناعت نہ کر کے عصری علوم کے حصول میں لگنے کے بعد اور اسے بھی یہ راستہ معاشی اعتبار سے اچھا لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ یا نظریہ مدارس دینیہ کے قیام اور علماء دین کے کام سے میل نہیں کھاتا تھا، اس لئے اکابر نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور بالکل صحیح کیا، حضرت شیخ الاسلامؒ کے سامنے کسی نے اس تجویز کو رکھا تو حضرت نے برجستہ پوچھا ”اس حماقت کا فائدہ؟۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے سامنے کسی نے یہ بات رکھی تو فرمایا” آپ مظاہر کے قریب ایک صنعتی ادارہ قائم کر کے یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ سب کام ہم ہی کیوں کریں؟ جو ہم کر سکتے ہیں ذمہ داری سے کر رہے ہیں“۔

دو بڑے اور مرکزی مدارس کے بڑوں کا جو جواب آپ نے پڑھا تقریباً سب ہی اکابر علماء کا خیال یہی تھا، کیوں کہ اولاً علم دین وہ علم ہے جس سے اشرف واعلیٰ کوئی علم ہے نہ صنعت، جس طرح ہر علم وفن کے ماہرین وقت کی اور امت کی ضرورت ہیں اس سے کہیں زیادہ امت کو ماہر علماءِ دین کی ضرورت ہے اور مدارس دینیہ اسی

ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک فئۃ قلیلۃ تیار کرنے میں مصروف ہیں، اکابر کو یہ تکلیف تھی کہ کروڑوں مسلم بچے ملک میں موجود ہیں اُنہیں چھوڑ کر یہ لوگ اس مٹھی بھر جماعتِ ملّا کو اس کے کوہ ودمن سے کیوں نکالنا چاہتے ہیں؟

ثانیاً عصری علوم اسلامی سانچے سے آزاد ہو چکے تھے، اب وہ علماءِ عرب کے بجائے یورپین اسکالرز کے قبضے میں تھے، ہندوستان میں تمام اسکول وکالج اور تمام موادِ تعلیم عیسائیت کے رنگ میں رنگا ہوا بلکہ دہریت کا پانی چڑھایا ہوا تھا، اسی وجہ سے اکابر اسے اپنے لئے تو کیا عام مسلمانوں کے لئے بھی سمِ قاتل سے کم نہیں سمجھتے تھے، اس کے اثر سے دین پسند گھرانے کی عورتیں تک اس سے دور تھیں، حضرت مولانا علی میاںؒ کی والدہ کو پتہ چلا کہ وہ دینی تعلیم کے ساتھ کچھ انگریزی بھی سیکھ رہے ہیں تو ڈریں کہ کہیں بیٹے کے دل میں علم دین کی وقعت کم نہ ہو جائے فوراً خط لکھا کہ ''علی! اگر مجھے اللہ تعالیٰ سو بیٹے دیتا تو میں ان سب کو علم دین ہی سکھاتی''۔

ثالثاً: اس زمانے میں علومِ عصریہ پڑھے ہی اس لئے جاتے تھے کہ اُن سے معاشی آسودگی حاصل ہو جائے، نوکریاں تلاش کی جائیں، اگر علماء ان سے وابستہ ہوتے تو آخر وہ بھی انسان ہیں اور کس انسان کو معاشی آسودگی کی تمنا نہیں ہوتی؟ جب کہ اسباب بھی مُیسر ہوں، اکابر کو ڈر تھا کہ اگر لوگوں کا یہ مطالبہ مان لیا جائے تو پھر جن مقاصد کے تحت مدارس دینیہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، وہی فوت ہو جائیں گے یعنی اُمت گم راہ ہوتی رہے گی اور کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا، اس لئے بہ قول حضرت شیخؒ کے ہم جان بوجھ کر ان کو وسائلِ معاش سے لولا لنگڑا رکھنا چاہتے ہیں تا کہ وہ خدمت دین وملت کے علاوہ کسی طرف نظر اُٹھا کے نہ دیکھیں، پوری یکسوئی سے خدماتِ دینیہ میں مشغول رہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ آج سے پچاس سال قبل تک مدارسِ دینیہ میں عصری تعلیم نہ ہونے کا شکوہ اور شامل کرنے کا مطالبہ جن نظریات کے تحت تھا وہ اس زمانے میں علمِ دین کے استخفاف پر مبنی تھا یا مدارسِ دینیہ کی روح ومقصد سے بے خبری پر مشتمل تھا، یا پھر دنیائے دنی کی وقعت کے پیش نظر علماءِ دین کی جز معاشی پر ترس کھاتے ہوئے کیا جاتا تھا، جس کے جواب میں اکابر کا موقف بھی یقیناً برحق تھا، غیرتِ دینی اور مصلحتِ ملّی سے آگہی پر مشتمل تھا، اپنے اکابر کی عقیدت اور ان کے علم ومعرفت پر کامل اعتماد کی وجہ سے راقم سطور کا بھی تین دہائی قبل تک یہی خیال تھا اور اس پس منظر کی حد تک اب بھی یہی ہے، والحمد للہ علی ذالک

موجودہ حالات اور تقاضے

لیکن اب ملک وملت کے حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں، ملک وملّت کے موجودہ حالات بہ جا طور پر متقاضی ہیں کہ مدارسِ دینیہ میں عصری تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے، اب یہ تقاضے معقول اور قابلِ قبول ہیں، یہ

تقاضے اب کسی ایسے طبقے کی طرف سے نہیں ہیں جو مدارسِ دینیہ کے اغراض ومقاصد سے بے خبر ہے یا محض معاشی تناظر میں سوچتا ہے، بل کہ ملک وملت کے حالات اور اُمت کی موجودہ ضروریات پر گہری نظر اور مضبوط فکر رکھنے والے علماءِ کرام کی طرف سے سامنے آرہے ہیں، ان حضرات کے اس نتیجے پر پہنچنے اور پوری بصیرت کے ساتھ دونوں تعلیم میں اشتراک کی وکالت وسفارش کرنے کے پیچھے دو عوامل ہیں، ایک ضرورت دوسرے مجبوری، ان دونوں پر ذیل میں علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ نفس مسئلہ پر غور کرنے میں مدد مل سکے۔

جہاں تک ضرورت کا مسئلہ ہے تو یہ حقیقت ہے کہ ملک میں برطانوی سامراج کے تحت جب تعلیمی نظام کو اسلامی نصاب ومسلم کلچر سے آزاد کر کے آزاد خیال اور لبرل قسم کا نظام ونصاب رائج کیا گیا، نیز ذریعۂ تعلیم ملکی زبانوں کے بہ جائے انگریزی زبان کو بنایا گیا تو علماء کرام نے اس تبدیلی کی کھل کر مخالفت وانکار کیا، مگر مخالفت مخالفت کی حد تک ہی رہی، یہ علماء نہ عوام کو اس طرف جانے سے روک سکے نہ ہی اس کا متبادل فراہم کر کے دے سکے، بس دینی تعلیم کے فضائل بیان ہوتے رہے اور عصری تعلیم کے ضمنی، تہذیبی نقصانات کی سخت مذمت کی جاتی رہی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ یا تو علمِ دین پڑھنے میں لگ گئے یا پھر اسی ماحول ونظام کے تحت عصری تعلیم حاصل کرتے رہے، ظاہر ہے کہ دینی تعلیم کی طرف آنے والے طلبہ تین فی صد سے زائد کبھی نہ ہو سکے ستانوے فی صد مسلم بچے اسکول ایجوکیشن کی طرف راغب اور اسی سے وابستہ ہوتے رہے، دینی راہنمائی کی محتاجی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب اس میں برابر ہیں، یہ سب دینی راہ نمائی وسرپرستی کے لئے علماء کے محتاج ہیں اور او رعلماء ان کے مذہبی راہ نما وپیشوا!

- مدارس کے نصاب کی روح کتاب وسنت میں مہارت اور اس کی ترویج ہے اور ان کا مقصد دعوت ودفاع کے رجالِ کار تیار کرنا ہے، یہاں کا ذریعۂ تعلیم عربی وفارسی سے مرکب نہایت فصیح اردو ہے، اصطلاحات ومحاورات خالص علمی؛ تحقیقی؛ وفقہی ہوتے ہیں۔اس کے برخلاف کالجوں کے نصاب کی روح سائنس؛ جغرافیہ، حساب اور اب جدید صنائع وغیرہ ہیں، جن کا ذریعۂ تعلیم اکثر انگریزی اور کہیں کہیں علاقائی زبان ہے، بنا بریں عام مسلمان اپنی مادری اور علمی زبان سے تقریباً محروم ہیں اور علماء کرام اپنی قوم کی مستعمل زبان سے تقریباً ناواقف! گویا زبانِ یارِ من ترکی ومن ترکی نمی دانم کے مصداق ہیں، علماء اپنے فرائض تبلیغ پوری ذمہ داری اور ایثار وقربانی سے اب بھی انجام دے رہے ہیں لیکن ان سے مستفید ہونے والوں کا حلقہ دن بہ دن محدود ہوتا جارہا ہے، وجہ یہ نہیں ہے کہ سارے ہی مسلمان دین بیزار ہو گئے ہیں، ہرگز نہیں! اب بھی ایک بڑے طبقے کو دینی

پیاس اور اللہ رسول سے تعلق ومحبت کسی درجے میں سہی قائم ہے، اور وہ علماء سے دین سمجھنا چاہتے ہیں، مگر علماء جو خالص مدرستی اردو میں لکھتے اور بولتے ہیں اور جن قدیم محاورات واصطلاحات میں سمجھاتے ہیں، بدقسمتی سے وہ اُنہیں ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتے، علماء کے ہاں کمال مشکل سے مشکل اور مقفی ومسجع اردو بول لکھ سکنا ہے، جس میں وہ کامیاب بھی ہیں لیکن عوام معمولی بول چال کی اردو جانتی ہے زیادہ گاڑھی ان کے حلق سے نہیں اُترتی، علماء کی اردو عربی وفارسی سے مرکب ہے عوام کی اردو میں اب ہر مشکل لفظ کی جگہ انگریزی الفاظ رائج ہیں، اب تو عام بول چال میں خود علماء کے گھرانوں میں بھی کتنے ہی انگریزی الفاظ اردو میں مستعمل ہیں، حاصل اس پوری گفتگو کا یہ ہے کہ خواہی نہ خواہی جب امت مسلمہ ہندیہ کا ایک بڑا طبقہ اردو زبان سے دور ہوگیا، اب سوائے اہلِ مدرسہ کے اور کہیں صحیح اردو باقی نہیں ہے (بالخصوص علمی ومذہبی موضوعات میں) تو کب تک ہم انگریزی سے چڑھتے اور دور بھاگتے رہیں گے؟ اور علماء کو قوم کی زبان سے محروم رکھیں گے؟ اسی دعوتی ضرورت کے لئے مدارس میں انگریزی زبان شامل کرنے کی بات ملت کے احوال سے باخبر علماء عرصے سے محسوس کررہے ہیں، یہ تقاضہ محض علماء کرام کو زیادہ مفید وکارآمد بنانے اور عصری تعلیم یافتہ طبقے کو الحاد وارتداد کے فتنوں سے بچانے کے لئے ہے۔

● اسی طرح ملک میں بعض علاقوں کے علماء تو علاقائی زبان ہی استعمال کرتے ہیں مثلاً بنگال، گجرات وغیرہ لیکن جنوبی ہند کی اکثر ریاستوں میں علماء کرام بچپن سے مدارس میں رہنے اور صرف اردو بولنے کی وجہ سے اپنے علاقے کی زبان یا تو سرے سے جانتے ہی نہیں یا پھر اس میں بیان وغیرہ نہیں کرسکتے، کسی مسئلے کی وضاحت نہیں کرسکتے جس کی وجہ سے وہ صرف مسجد ومدرسہ تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ جاہل جو علاقائی زبان اچھی طرح بول لیتا ہے وہ مقبول داعی بنا ہوا ہے، اِن علماء کے علاقے میں اہل باطل جو گم راہیاں پھیلا رہے ہیں وہ علاقائی زبان خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور عصری تعلیم یافتہ بھی ہیں اس طرح پڑھے لکھے طبقے پر قبضہ جما کر بہ آسانی اپنی گم راہیوں کے جال میں پھنسا رہے ہیں، ان سے مطمئن ہونے کے بعد اب یہ لوگ علماء حق کی سننا تو دور کی بات ہے ملنے کے لئے تک آمادہ نہیں ہوتے، اس لئے ہر علاقے کے مدارس میں علاقائی زبان بھی لازماً پڑھائی جانی چاہئے، جب علم دین کا مقصد تنہا اپنی دین داری نہیں قوم وملت کی فلاح وبہبود اور مخالفین اسلام کا مقابلہ بھی ہے تو وسائل سے محروم عالم ان مقاصد کی تکمیل کیسے کرسکتا ہے؟۔

● قرآن مجید علم دین کی اساس ہے اور اس کا بڑا حصہ مضمونِ توحید پر مشتمل ہے، حق تعالیٰ شانہٗ اپنے وجود اور ذات وصفات کے احقاق واظہار کے لئے زیادہ تر آفاق وانفس میں تدبُّر کی طرف بندوں کو دعوت دیتے ہیں، جو عامی اور عالم کو یکساں طور پر نفع دیتا ہے، آفاق وانفس میں تدبُّر ہی فزیکل سائنس اور میڈیکل سائنس کہلاتی

ہیں، مفسرین نے قرآن کریم کے ایسے مقامات پر کچھ نہ کچھ تفصیل طبعیات و ماحولیات اور فلکیات پر مشتمل بیان کی ہے لیکن مدارس دینیہ میں چوں کہ فلسفہ قدیم ہی چل رہا ہے جو پڑھنے والے کی سمجھ میں آتا ہے نہ پڑھانے والے کو دلچسپی ہوتی ہے (الا ماشاءاللہ) محض عبارات کو حل کرانے پر اکتفا ہو جاتا ہے، بعض مدرسوں میں تو خارجِ نصاب بھی کر دیا گیا ہے، حالاں کہ غیب کے ان عقیدوں پر یقین کا مقام حاصل کرنے کے لئے خود عالم کو بھی سائنس جدید سے کچھ مناسبت ہونا بہت مفید ہے، اور دوسروں کو مطمئن کرنے اور اچھی طرح سمجھانے کے لئے بھی قرآن کریم کی ایسی آیات سے خوب مدد لی جا سکتی ہے، (تعلیم یافتہ طبقے کو ان کے انداز سے اور غیر تعلیم یافتہ طبقے کو ان کی سمجھ کے مطابق)، لیکن اس کے لئے عربی اصطلاحات کے بہ جائے زمانے میں رائج جدید اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے، اس لئے دعوتِ دین کی مصلحت کے طور پر علماء کو بہ قدر ضرورت جدید سائنس کا پڑھانا وقت کی اہم ضرورت بن گیا ہے۔

● جغرافیہ اور حساب کی اہمیت خود اسلام میں کتنی ہے سب کو معلوم ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، اس کے باوجود آج ہمارے علماء کی اکثریت ان مضامین میں بھی بہت کم زور ہے، حالاں کہ خود میراث کی تقسیم اور دیگر دین و دنیوی امور کے لئے حساب کی سخت ضرورت ہے اور تاریخ کو اچھی طرح سمجھنے سمجھانے کے لئے جغرافیہ کی اہمیت محتاجِ ثبوت نہیں، اس لئے تھوڑی تعلیم اس کی بھی ہونی چاہئے۔

بعض اشکالات اور جواب

اس جگہ بعض اذہان میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن اکابر علماء نے خالص دینی تعلیم حاصل کی تھی، اِن علماء کے ذریعے نا قابلِ تصور دعوتی و اصلاحی کارہائے نمایاں انجام پائے اور پا رہے ہیں تو ان علوم کے نہ پڑھنے سے اُنہیں یا اُن کی ملی خدمات کو کیا نقصان پہنچا؟ گو اس تحریر کے مخاطبین کو نہ یہ سوال ہوگا نہ اُنہیں جواب دینے کی ضرورت ہے، البتہ بعض علماء کے اطمینان کی خاطر عرض ہے کہ اکابر علماء دیوبند جس زمانے میں پڑھتے تھے اس زمانے میں زبانوں کی زیادہ اہمیت نہ تھی کیوں کہ ملک میں مسلمانوں کی اکثریت بہترین اردو سے واقف تھی حتیٰ کہ اس وقت کے غیر مسلم بھی علمی و اسلامی اصطلاحات کو بہ آسانی سمجھ جاتے تھے، عربی فارسی اردو میں مہارت بہت کافی تھی، باقی علوم ان کے دور میں مدارسِ دینیہ میں شاملِ نصاب تھے، چناں چہ ان کی تفسیریں اور تصنیفیں اور مناظرات، مباحثات اس کا واضح ثبوت ہیں کہ انھوں نے منکرین و ملحدین کا مقابلہ ہر فن سے کیا اور کامیاب کیا، فرق صرف یہ ہے کہ اب انہی علوم کی زبان و مصطلحات بدل گئی ہیں اس لئے جدید نصاب کے ذریعے ان علوم کو بہ مدِ دعوتِ دین پڑھانا طلبہ کی بہت اہم ضرورت ہے، ورنہ علماء سے نامانوس طبقے میں جس تیزی سے الحاد

وارتداد داخل ہورہا ہے اس کے ذمہ دار وہ اہلِ مدارس بھی ہوں گے جو اتنی سخت ضرورت کے باوجود روایتی انداز سے انحراف کو گناہِ کبیرہ یا شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں۔

رہ گیا یہ سوال کہ اگر یہ دعوت کی ضرورت ہی ہے تو مدارس کا نظام متأثر کرکے یہ ضرورت پوری کرنا ہی کیا ضروری ہے؟ فراغت کے بعد کہیں بھی جاکر اس کمی کو پورا کرلیا جاسکتا ہے، سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو ہر طالب علم اس کی اہلیت و استطاعت نہیں رکھتا، ثانیاً: اہلیت ہے بھی تو اپنی عمر اور خانگی تقاضوں کی وجہ سے مزید وقت نہیں دے سکتا، ثالثاً دے بھی سکتا ہے اور دے کر کہیں داخلہ لے کر پڑھتا ہے تو ماحول کے یکسر بدل جانے کی وجہ سے خطرہ ہے کہ اس کے خیالات بھی بدل جائیں، تہذیبِ اسلامی اور ہیئتِ مسنونہ کو بھی چھوڑ بیٹھے جیسا کہ اکثر مشاہدہ ہے کہ ایسے فضلاء میں بدنام کنندۂ اسلاف؛ مدارس کے ناسپاس؛ اور عبدالدنیا ہی زیادہ نظر آتے ہیں جو خدمت دین کے میادان کو چھوڑ کر حطام ومتاعِ دنیا کے گرویدہ ہوجاتے ہیں، انہی کو دیکھ کر اکابر اساتذۂ مدارس اس تعلیم کا نام سننا نہیں چاہتے، ان وجوہ سے اگر ہم عصری تعلیم کا بہ قدر ضرورت حصہ ایک اچھی ترتیب کے ساتھ مدارس دینیہ میں شاملِ نصاب کرلیں اور نسبتاً کم ضروری مضامین حذف کرلیں تو مذکورہ مفاسد ومضار سے حفاظت رہے گی اور فضلاءِ مدارس حسبِ معمول خدماتِ دینیہ ہی میں لگیں گے اور زیادہ مؤثر ومفید نتائج سامنے آئیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس واقعی ضرورت اور میدانی تجربات کی روشنی میں دفاع ودعوتِ دین کے مردِ میدان علماء کرام کو علومِ دینیہ شرعیہ کے ساتھ ساتھ محض دعوت وارشاد کے ناگزیر وسائل کے عنوان سے علومِ عصریہ کا حامل بنانے کی ضرورت گزشتہ بیس پچیس سالوں سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ ملت کے تعلیم یافتہ سنجیدہ اور قیمتی طبقے کو جواب بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے نام نہاد اسلامک اسکالرز کے ملحدانہ ومجرمانہ خیالات کے شکار ہونے سے بچایا جاسکے، جن کی دینی پیاس اور فکری تشنگی کی تسکین موجودہ علماء باوجود حقیقی عالم اور سچے وارث ہونے کے بھی نہیں کرسکے اور وہ بے علم جو شخصی مطالعۂ اسلام کے ذریعے خود ہی گم راہ ہیں محض زبان وبیان کی خوبی اور عصری اصطلاحات وعبارات کی سہولت سے اُن پر چھا گئے، ہم نے اس نقصان کو اپنا نقصان نہیں سمجھا، جب کہ ہمارے امام حجۃ الاسلامؒ سفرِ حج میں جب اسلام سمجھنا چاہنے والے انگریز پائیلیٹ کو ترجمان کے ذریعے صحیح نہیں سمجھا سکے تو ارادہ فرمایا کہ حج سے واپسی کے بعد میں خود انگریزی زبان سیکھ لوں گا، دعوت ودفاع ہی کی مصلحت سے، علامہ کشمیریؒ نے سو سال قبل دارالعلوم کو مشورہ دیا تھا کہ شعبۂ انگریزی شروع کیا جائے، دعوت ودفاع ہی کے مدنظر، محدث سہارن پوریؒ نے مظاہر میں شعبۂ سنسکرت قائم کرواکے اس کے لئے ایک نومسلم ماہر سنسکرت کا تقرر فرمایا

تھا، دعوت ودفاع ہی کی مصلحت سے، غزالیؒ ورازیؒ نے فلسفۂ مغرب میں کمال حاصل کیا تھا، دعوت ودفاع ہی کی ضرورت سے، امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو قیدیوں سے اجنبی زبان سیکھ لینے کو فرمایا تھا، اور آپ حضرات کہیں زیادہ اس کے بارے میں جانتے ہیں مگر پتہ نہیں کیوں اہل مدارس نے اس جانب توجہ نہیں کی؟ یا تو اُنہیں میدانی صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہوا یا مضرات کو مفادات سے زیادہ سمجھا مگر ہمیں ان کی بصیرت اور اولوالعزمی سے ایسی کوئی بدگمانی کی جرأت نہیں ہے۔

بہ ہر حال مدارسِ دینیہ میں عصری تعلیم کی شمولیت کا ایک عامل دعوت ودفاعِ اسلام کی ضرورت ہے جو ہمارا اپنا داخلی وملی مسئلہ ہے میرا خیال ہے کہ مدارس میں اس کا حکیمانہ طریقے پر لزوم اسی ضرورتِ دعوت ودفاع کے حوالے سے ہونا چاہیئے، اور اس کی ترتیب ایسی بنی چاہیئے کہ مدارس کا حقیقی موضوع ومقصد متاثر نہ ہو بل کہ مفید تر ہو، مل بیٹھ کر غور کرنے سے بہتر شکلیں سامنے آسکتی ہیں، عموماً مدارس میں طلبہ اقامتی طور پر شریکِ مدرسہ رہتے ہیں، اس لئے ساعاتِ تعلیمیہ ابتدائی جماعتوں میں سات سے بڑھا کر آٹھ نو کی جاسکتی ہیں اور موجودہ ساعات میں سے بھی کم از کم دو عصری تعلیم کے لئے لی جاسکتی ہیں۔

میرے خیال میں فی الحال اسی ضرورت کے مدنظر ہمیں سوچنا چاہیئے، نئ قومی پالیسی کی مصیبت مدارس پر جب منڈلائے گی تو ہمارے بنائے ہوئے نظام میں معمولی تبدیلی کے ساتھ اس پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے، کیوں کہ بہت جلد اس کا خطرہ نہیں ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی کے خدوخال

دوسرا عامل موجودہ حکومت کی سوچ اور اقتدار کا مخصوص رنگ اور متعصب انداز ہے، جس کی زد میں آنے سے تعلیم جیسا آزاد میدان بھی بچ نہ سکا، چناں چہ اطلاعات کے مطابق حکومت کی جدید تعلیمی پالیسی یا قومی تعلیمی پالیسی (NEP) کو پارلیمنٹ میں منظوری مل گئی ہے، اور حکومت نے جسے ۲۰۲۳ء کے تعلیمی سال سے پورے ملک کے ڈھائی لاکھ منڈلوں میں نافذ کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اس کے حوالے سے چند اُمور پر غور کرنا اہلِ مدارس کے لئے ضروری ہے، نیز بل کی دفعات کے علاوہ اس کے پیچھے کارفرما محرکات ومضمرات کو سنجیدگی سے لے کر سوچنا بھی ضروری ہے، مسئلہ سرسری نہیں ہے، بل کہ بہت دور رس نتائج اور سنگین اثرات کا حامل ہے، کیوں کہ جدید تعلیمی پالیسی کسی جمہوری حکومت کے پالیسی ساز ادارے کی اصلاحی سفارش پر مرتب نہیں ہوئی ہے، ایک بنیادی طور پر مسلم مخالف اور خالص ہندو نواز تنظیم RSS کی جانب سے وضع کردہ پالیسی ہے جو گذشتہ نو

دہائیوں سے ہر قسم کی عملی سیاست اور شور وشہرت سے دور رہتے ہوئے ہندونوازی، ہندو برتری اور ہندو سماج کے غلبے و استحکام کے اپنے ایجنڈے پر کاربند ہے، اور جس کے دسیوں لاکھ ہم خیال ماہرین ملک کے شعبہ ہائے اقتدار پر قابض ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا ایک ڈرافٹ تو وہ ہے جو غالباً 450 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں بہت باتیں قابلِ اعتراض اور دستور سے متصادم محسوس کی گئیں ہیں، اور ایک وہ ہے جسے پارلیمنٹ میں پیش کر کے پاس کروالیا گیا ہے (یہ ڈرافٹ قانون میں شامل ہو چکا ہے) اس ڈرافٹ کے اردو ترجمہ (مترجمہ سید محمد عادل فریدی) سے چند ضروری اقتباسات پہلے ملاحظہ کرلی جائیں تاکہ اہل مدارس کو مدارس کے سلسلے میں غور کرنا آسان ہو جائے۔

(۱)

”ہندوستان کی قدیم اور سناتنی علوم اور افکار کی خوش حال روایت کی روشنی میں یہ پالیسی تیار کی گئی ہے۔علم، دانش مندی اور حق کی تلاش کو ہندوستان کی فکری روایات اور فلسفہ میں ہمیشہ سب سے اونچا انسانی ہدف مانا جاتا تھا۔قدیم ہندوستان میں تعلیم کا مقصد دنیاوی زندگی یا اسکول کے بعد کی زندگی کی تیاری کی شکل میں علم حاصل کرنا نہیں بلکہ مکمل ادراک نفس اور نجات کی شکل میں مانا گیا تھا۔تکش شلا ، نالندہ، وکرم شلا اور ولّبھی جیسے قدیم ہندوستان کے عالمی معیار کے اداروں نے تعلیم کے مختلف شعبوں میں تدریس اور ریسرچ کے بلند تر ریکارڈ قائم کیے تھے اور مختلف پس منظر اور ملکوں سے آنے والے طلبہ اور دانشوروں کو مستفید کیا تھا۔اسی نظام تعلیم نے چرک، سُشرت، آریہ بھٹ، وراہمیہر ، بھاسکراچاریہ، برہما گپت، چانکیہ، چکرپانی دتّا، مادھو، پاننی، پتنجلی، ناگارجن، گوتم، پنگلا ، شنکر دیو، میتری، گارگی اور تھروولّور جیسے متعدد عظیم اصحاب علم و دانشوروں کو جنم دیا۔اِن اصحابِ علم نے عالمی سطح پر علم کے مختلف شعبوں مثلاً ریاضی، فلکیات، دھات کاری، علم طب، سرجری، سول انجینئرنگ، فن تعمیر، کشتی بانی، علم الجہات، یوگ، فنون لطیفہ، شطرنج وغیرہ میں مصدقہ طور پر بنیادی خدمات انجام دیں۔ہندوستانی ثقافت اور فلسفہ کا دنیا میں بڑا اثر رہا ہے۔عالمی اہمیت کی اس خوش حال وراثت کو آنے والی نسلوں کے لئے نہ صرف محفوظ کر کے رکھنے کی ضرورت ہے بلکہ ہمارے نظامِ تعلیم کے ذریعہ پر ریسرچ کا کام ہونا چاہیئے، ان میں اور اضافہ کرنا چاہیئے اور نئے نئے استعمال بھی سوچے جانے چاہیئں۔(قومی تعلیمی پالیسی 2020،صفحہ:5)

(۲)

"تعلیم ایک عوامی خدمت ہے: معیاری تعلیم تک رسائی کو ہر بچے کا پیدائشی حق مانا جانا چاہیئے"
(قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:8)

(۳)

"این سی ای آر ٹی کے ذریعہ آٹھ سال کی عمر تک کے سبھی بچوں کے لئے دو حصوں میں بچپن کی ابتدائی تعلیم کے لئے ایک عمدہ نصاب اور تعلیمی ڈھانچہ (این سی پی ایف ای سی سی ای) تیار کیا جائے گا۔ یعنی 3-0 سال کے بچوں کے لئے ایک سب فریم ورک اور 8-3 سال تک کے بچوں کے لئے ایک دوسرا سب فریم ورک تیار کیا جائے گا۔ مذکورہ بالا ہدایات کے مطابق ای سی سی ای قومی و بین الاقوامی تجدید و اختراع اور عمدہ ترین طریقوں پر جدید ترین ریسرچ کو شامل کرے گا۔ خاص طور پر ان طریقوں کو جو ہندوستان میں کئی صدیوں سے بچپن کی تعلیم کے فروغ کے لئے کافی ہیں اور انہوں نے مقامی روایات میں نشو ونما پائی ہے، جن میں آرٹ، کہانیاں، نظمیں، کھیل، گیت اور بہت کچھ شامل ہیں، ان سبھی کو بنیادی طور پر شامل کیا جائے گا، تعلیم کا یہ ماڈل ماں باپ دونوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی ابتدائی دیکھ بھال اور تعلیم کے لئے بھی ایک راہنمائی شکل میں کام کرے گا۔" (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:10)

(۴)

"دوسرا قدم یہ ہے کہ اسکولوں میں سبھی بچوں کی حصہ داری یقینی ہو، اس کے لئے بہت دھیان سے سبھی طلبہ کی نگرانی کرنی ہوگی، ساتھ ساتھ ان کے سیکھنے کی سطح پر بھی نظر رکھنی ہوگی تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ (الف) اسکول میں داخلہ لے رہے ہیں اور حاضر ہو رہے ہیں۔ (ب) ڈراپ آوٹ بچوں کے لوٹنے اور اگر وہ پیچھے رہ گئے ہیں تو انہیں دوبارہ مین اسٹریم سے جوڑنے کے لئے مناسب سہولتیں دستیاب ہیں۔ فاؤنڈیشنل اسٹیج سے لے کر بارھویں درجہ تک کی تعلیم کے ذریعہ 18 سال کی عمر تک کے سبھی بچوں کو مساوی معیاری تعلیم فراہم کرنے کے لئے بنیادی سہولیات دستیاب کرائی جائے گی، تربیت یافتہ اساتذہ اور ملازموں کی بحالی اسکول میں کی جائے گی، جس سے استاذ ہمیشہ طلبہ اور اس کے سرپرستوں کے ساتھ کام کرسکیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی یقینی بنایا جاسکے کہ سبھی اسکول آرہے ہیں اور سیکھ رہے ہیں، ریاستی اور ضلعی سطح پر معذور افراد کو بااختیار بنانے سے متعلق سول سوسائٹی تنظیم/سماجی انصاف، اور امپاورمنٹ ڈپارٹمنٹ کے تربیت یافتہ اور قابل سماجی کارکن/ریاستی/سنٹرل اسٹیٹ (UnionTerretories)

کی حکومتوں کے ذریعہ اختیار کئے گئے مختلف جدید میکانزم سے اس ضروری کام کو کرنے میں اسکولوں کو جوڑا جاسکتا ہے۔‘‘ (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:14)

(۵)

’’معاشرتی و معاشی طور پر محروم طبقات (ایس ای ڈی جی) پر خصوصی زور دیتے ہوئے سبھی طلبہ کو سیکھنے میں مدد کرنے کے لئے اسکولی تعلیم کے دائرے کو وسعت دینا ہوگا، تاکہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے اندر سیکھنے کے مختلف راستے دستیاب ہوسکیں۔ ہندوستان کے ان نوجوانوں کے لئے جو کسی ادارہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ہیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (این آئی او ایس) اور ریاستوں کے اوپن اسکولوں کے ذریعہ پیش کردہ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (او ڈی ایل) پروگرام کی توسیع کی جائے گی اور اس کو مستحکم بنایا جائے گا تاکہ ایسے نوجوانوں کی سیکھنے کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔‘‘
(قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:15)

(۶)

’’فنون کا انضمام ایک کراس نصاب تعلیم جس میں آرٹ اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں اور شکلوں کو مضامین میں تصورات کو سیکھنے کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تجربات پر مبنی تعلیم پر خاص زور دیے جانے کے تحت آرٹ انٹگریشن طرز تدریس کو کلاس روم کے کاموں میں مقام دیا جائے گا۔ جس سے نہ صرف کلاس زیادہ پرکشش بنے گی بلکہ ہندوستانی فنون اور ثقافت کو تعلیم میں داخل کرنے سے ہندوستانیت سے بھی بچوں کا تعارف ہو پائے گا۔ اس پیش رفت سے تعلیم اور ثقافت کے باہمی تعلقات کو بھی مضبوطی ملے گی۔‘‘ (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:17)

(۷)

’’اس تعلق سے اعلیٰ ترین معیار والی سائنس ریاضی میں دولسانی نصابی کتابوں اور درسی مواد کو تیار کرنے کی سبھی کوششیں کی جائیں گی، تاکہ طلبہ دونوں مضامین پر سوچنے اور بولنے کے لئے اپنے گھر کی زبان/ مادری زبان اور انگریزی دونوں میں اہل ہوسکیں۔‘‘ (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:19)

(۸)

’’اس طرح ملک میں ہر طالب علم پڑھائی کے دوران ’’دی لینگویج آف انڈیا‘‘ پر ایک مزیدار پروجیکٹ/ سرگرمی میں طلبہ زیادہ سے زیادہ تر اہم ہندوستانی زبانوں کے قابل ذکر اتحاد کے بارے میں

جانیں گے جس کے تحت ان کے عام صوتی اور سائنسی لحاظ سے ترتیب شدہ حروف تہجی، رسم الخط، ان کے عام نحوی وصرفی ڈھانچے، سنسکرت اور دوسری کلاسیکی زبانوں سے ان کے الفاظ کے ذرائع اور اصلیت کو ڈھونڈنے سے لے کر ان زبانوں کے بھرپور اندورونی اثر اور فرق کو سمجھنا شامل ہے۔ وہ یہ بھی جانیں گے کہ کون سے جغرافیائی علاقہ میں کون سی زبانیں بولی جاتی ہیں، آدی باسی زبانوں کی فطرت اور اس کی ساخت کو سمجھیں گے اور ہندوستان کی ہر اہم زبان میں کچھ سطریں اور ہر زبان کے خوش حال اور اُبھرتے ہوئے ادب کے بارے میں کچھ کہنا سیکھیں گے۔" (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:19)

(۹)

"ہندوستان کی کلاسکی زبانوں اور ادب کی اہمیت، مطابقت اور خوب صورتی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، سنسکرت آئین کے آٹھویں شیڈول میں مذکور ایک اہم جدید زبان ہوتے ہوئے بھی اس کا کلاسیکی ادب اتنا وسیع ہے کہ سارے لیٹن اور گریک ادب کو بھی اگر ملا کر اس کا تقابل کیا جائے تب بھی وہ اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ سنسکرت ادب میں ریاضی، فلسفہ، گرامر، موسیقی، سیاست، طب، فن تعمیر، میٹالرجی (فن دھات کاری)، ڈرامہ، نظم، کہانی اور بہت کچھ (جنہیں سنسکرت نظام علم کہا جاتا ہے) کے وسیع خزانے ہیں۔ ان سب کو مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ساتھ لامذہب لوگوں اور ہر شعبۂ زندگی، معاشرتی ومعاشی پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے ہزاروں سالوں میں لکھا ہے۔ اس طرح سنسکرت کو سہ لسانی کے مین اسٹریم آپشن (اہم ترین متبادل) کے ساتھ اسکول اور اعلیٰ تعلیم کے سبھی سطحوں پر طلبہ کے لئے ایک اہم، بھرپور متبادل کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ یہ ان طریقوں سے پڑھا جائے گا جو دلچسپ اور اثر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کے ہم آہنگ ہیں، جس میں سنسکرت نظامِ علم کا استعمال شامل ہے اور خاص طور پر آواز اور تلفظ کے ذریعے" (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:19)

(۱۰)

"ہندوستان میں کلاسیکی تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، اُڑیا سمیت دیگر کلاسیکی زبانوں میں ایک بہت ہی بھرپور ادب موجود ہے، ان کلاسیکی زبانوں کے علاوہ، پالی، فارسی، اور پراکرت زبانوں اور ان کے ادب کو بھی ان کی ترقی کے لئے اور آنے والی نسلوں کی خوش حالی کے لئے محفوظ کیا جانا چاہیئے۔ جیسے ہی ہندوستان پوری طرح سے ترقی یافتہ ملک بنے گا، اگلی نسل ہندوستان کے وسیع اور خوب صورت کلاسیکی ادب کے مطالعہ میں حصہ لینا اور انسان کی شکل میں خوش حال بننا چاہے گی۔ سنسکرت کے علاوہ ہندوستان

کی دیگر کلاسیکی زبانیں اور ادب جن میں تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، اوڑیا، فارسی اور پراکرت زبانیں شامل ہیں، اسکولوں میں بھی طلبہ کے لئے متبادل شکل میں ممکنہ طور پر آن لائن ماڈل کے طور پر یقینی بنایا جاسکے۔ سبھی ہندوستانی زبانوں کے لئے جو بھرپور زبانی وتحریری ادب، ثقافتی روایات اور علم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اسی طرح کوششیں کی جائیں گی ''(قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:20)

(۱۱)

''سبھی زبانوں کی تعلیم میں جدید اور تجرباتی طریقوں سے اضافہ کیا جائے گا، مثال کے طور پر تعلیم کو آسان کیا جائے گا، اور ایپس کے ذریعہ زبان کے ثقافتی پہلوؤں؛ مثلاً فلم، تھیٹر، کہانی سنانے، نظم اور موسیقی کو جوڑتے ہوئے مختلف متعلقہ مضامین کے ساتھ اور حقیقی زندگی کے تجربات کے ساتھ تعلقات کو ظاہر کرتے ہوئے اُنہیں سکھایا جائے گا۔ اس طرح زبانوں کی تعلیم بھی تجرباتی اور اثر انگیز نظامِ تعلیم پر مبنی ہوگی۔'' (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:20)

(۱۲)

''بچوں کو پنچ تنتر (سنسکرت میں لکھی ایک قدیم کہانیوں کی کتاب) کی بنیادی کہانیاں، جاتک (مہاتما بدھ کی زندگی سے متعلق کہانیوں کی کتاب)، ہتوپدیش (پند و نصائح پر مشتمل ایک قدیم سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی کتاب) اور دیگر مزیدار روایتی کہانیوں اور ہندوستانی روایات سے متاثر کہانیوں کو پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملے گا اور عالمی ادب پر اُن کے اثرات کے بارے میں وہ بھی جانیں گے۔''

(قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:22)

(۱۳)

''یہ تعلیمی پالیسی ایسے اہداف کو لے کر آگے بڑھتی ہے جس میں ملک ہندوستان کے کسی بھی بچے کے سیکھنے اور آگے بڑھنے کے مواقع میں اس کی پیدائش یا پس منظر سے متعلق حالات رکاوٹ نہ بن پائیں۔ یہ پالیسی اس بات کی دوبارہ تصدیق کرتی ہے کہ اسکولی تعلیم میں رسائی، حصہ داری اور تعلیمی نتائج میں سماجی زمرے کی تفریق کو ختم کرنا بھی سبھی تعلیمی شعبوں کی ترقیاتی پروگراموں کا بنیادی مقصد ہوگا۔ اس باب کو باب 14 کے ساتھ پڑھا جائے، جس میں اعلیٰ تعلیم میں مساوات اور جامعیت کے معاملوں پر تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔'' (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ:33)

(۱۴)

”اسکول اوراعلیٰ تعلیم میں اقلیتی طبقات کی نمائندگی بھی توقع سے کم ہے،یہ پالیسی سبھی اقلیتی طبقات اورخاص کران طبقات کے بچوں کی تعلیم کوفروغ دینے کے لئے دخل اندازی کی اہمیت کو قبول کرتی ہے جن کی تعلیمی طور پرنمائندگی کم ہے۔“(قومی تعلیمی پالیسی2020،صفحہ:34)

(۱۵)

”اس کے علاوہ متعدد کامیاب پالیسیاں اوراسکیمیں شروع کی گئی ہیں جیسے ٹارگٹ اسکالرشپ، والدین کواپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے لئے حوصلہ افزائی کے طورپرشرط کے ساتھ نقد رقم کی فراہمی، ٹرانسپورٹ کے لئے سائکل مہیا کرناوغیرہ۔جس سے کچھ علاقوں میں ایس ای ڈی جی کی حصہ داری اسکولی تعلیم نظام میں کافی بڑھی ہے۔ان کامیاب پالیسیوں اورمنصوبوں کو پورے ملک میں اورزیادہ مضبوط کیا جاناچاہیئے۔“(قومی تعلیمی پالیسی2020،صفحہ:34)

(۱۶)

”ایک از سرِنو تشکیل شدہ اور پھر سے زندہ کیا ہواسنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (CABE) وزارت برائے فروغ انسانی وسائل (MHRD)اورریاستی سطح کے مقبول ومعروف اکائیوں/اداروں کے ساتھ مل کرمستقل بنیادوں پرملک میں تعلیم کے وژن کوترقی دینے،شفافیت قائم کرنے،اس کاتجزیہ کرنےاوراس پرنظرثانی کرنے کاذمہ دارہوگا۔“(قومی تعلیمی پالیسی2020،صفحہ:83)

(۱۷)

کسی بھی پالیسی کی اثرانگیزی/تاثیراس کےعمل درآمد/نفاذ پرمنحصرہوتی ہے،اس طرح کےعمل درآمد/نفاذ کے لئےکئی اداروں کے ذریعہ مشترکہ ومنظم طریقہ پرمتعدداقدامات کرنے ہوں گے اورکئی کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔اس لئے اس پالیسی کےنفاذ کوکئی اداروں،جن میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل (MHRD)،سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (CABE)،ریاستی حکومتیں،تعلیم سے متعلق وزارتیں، ریاستوں کےتعلیمی شعبے، تعلیمی بورڈس این ٹی اے (نیشنل ٹیسٹنگ ایجنسی)، اسکولوں اوراعلیٰ تعلیم کے انضباطی ادارے،این سی ای آرٹی، ایس سی ای آرٹی،اسکول اوراعلیٰ تعلیمی ادارے شامل ہیں،کے ذریعہ تعلیم کوشامل کرنے والے ان تمام اداروں میں منصوبہ بندی اورہم آہنگی کے ذریعے،پالیسی کواس کی روح اورمقاصد کے مطابق نافذکیاجائےگا۔

عمل درآمد کے لئے مندرجہ ذیل رہنما ضابطے ہوں گے۔

۱) پالیسی روح اور اغراض و مقاصد کا نفاذ سب سے اہم مسئلہ ہے۔

۲) پالیسی سے متعلق اقدامات پر مرحلہ وار طریقہ سے عمل کرنا بہت ضروری ہے، کیوں کہ پالیسی کے ہر پوائنٹ میں کئی اقدامات ہیں اور ہر مرحلہ اس نظریہ سے اہم ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اگلے مرحلے کے نفاذ کی بنیاد بنتا ہے۔

۳) ترجیحات طے کر کے کام کو ایک ایسے مرحلہ وار طریقہ سے کیا جانا ممکن ہوگا، جس میں سب سے زیادہ اہم اور انتہائی ضروری کام پہلے کیے جائیں تا کہ ایک مضبوط بنیاد تیار ہو سکے۔

۴) عمل میں جامعیت بہت اہم ہوگی، چوں کہ یہ پالیسی باہم مربوط اور ہمہ گیر ہے، اس لئے ٹکڑوں میں کوشش کرنے کے بجائے جامع نظریہ رکھتے ہوئے مکمل عمل درآمد کرنے سے ہی مطلوبہ مقاصد حصول یقینی بنے گا۔

۵) چوں کہ تعلیم ایک متصل مضمون ہے، لہذا اس کے لئے مرکز اور ریاستوں کے مابین محتاط منصوبہ بندی، مشترکہ نگرانی اور مشترکہ عمل درآمد کی ضرورت ہوگی۔

۶) پالیسی کے اطمینان بخش عمل درآمد/نفاذ کے لئے مرکزی اور ریاستی سطح پر مطلوبہ وسائل؛ مثلاً انسانی وسائل، بنیادی ڈھانچے، اور مالی وسائل کو بروقت جمع کرنا اہم ہوگا۔

آخر میں عمل درآمد/نفاذ کے لئے کئے جانے والے متعدد متوازی اقدامات کے مابین رابطوں کا محتاط تجزیہ اور جائزہ ضروری ہوگا تا کہ تمام اقدامات کو موثر انداز میں انجام دینے کو یقینی بنایا جاسکے۔ اس میں کچھ ایسے کاموں کی سرمایہ کاری شامل ہے (مثال کے طور پر ابتدائی بچپن کی تعلیم کے بنیادی ڈھانچہ میں) جو نہ صرف ایک مضبوط بنیاد بنانے کے نظریہ سے ضروری ہیں بل کہ مستقبل کے پروگراموں اور کاموں کے بغیر رکاوٹ کے چلنے کے لئے بھی لازم ہیں۔

(۱۸)

متعلقہ وزارتوں کے ساتھ مشورے اور ان کے اشتراک سے مرکزی اور ریاستی سطحوں پر موضوع وار عمل درآمد/نفاذی خصوصی کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو اس پالیسی کے مقاصد اور اہداف کو مرحلہ وار طریقہ سے اور صاف طور پر حاصل کرنے کے لئے مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق اس پالیسی کے ہر پہلو پر عمل درآمد کے لئے مفصل منصوبے تیار کریں گے۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل (ایم ایچ آر

ڈی) اور ریاستوں کی تشکیل کردہ نامزد ٹیموں کے ذریعہ پالیسی سے متعلق ہر ایکشن کے لئے طے شدہ اہداف کے مطابق پالیسی کی پیش رفت کا سالانہ مشترکہ جائزہ لیا جائے گا اور جائزوں کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (CABE) کے ساتھ شیئر کیا جائے گا۔ 40-2030 کی دہائی تک پوری پالیسی عمل در آمد/نفاذ کی شکل میں آچکی ہوگی (نافذ ہو چکی ہوگی)، جس کے بعد ایک بار اور جامع اور بڑے پیمانے پر جائزہ لیا جائے گا۔ (قومی تعلیمی پالیسی 2020، صفحہ: 86-85)

ان پیراگرفوں میں سے

نمبر ۱، ۳، ۶، ۱۲، اور ۱۸ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قومی تعلیمی پالیسی آزاد اور جمہوری انداز کی نہیں ہے، بل کہ اس کے پیچھے تعلیم اور تعلیم گاہوں کو عہد قدیم کے دیو مالائی اور سناتن دھرم سے وابستہ افکار ونظریات اور تہذیب کے رنگ سے رنگنے کا منصوبہ کارفرما ہے، اور پالیسی کی اسی روح وغرض کا نفاذ سب سے اہم مسئلہ ہے۔

نمبر ۲، ۴، ۵، ۱۳، اور ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ہر بچے بالخصوص اقلیتی طبقے کے بچوں کو متعلقہ عمر میں اسکول ایجوکیشن میں حصہ نہایت ضروری ہے، اور اس کے لئے حکومت ہر ممکن شکل اختیار کر سکتی ہے۔ (قانون لازمی تعلم کو بھی بلا استثناء نافذ کرنے کی بات بھی آزاد ذرائع سے سننے میں آئی ہے)

نمبر ۷، ۸، ۹، ۱۰، اور ۱۱ میں بتایا گیا ہے کہ نظام تعلیم میں ہندوستان کی قدیم ثقافتی زبانوں کے سیکھنے پر زور اور اس کی ترغیب دی جائے گی جس میں اردو کا کہیں ذکر نہیں ہے، البتہ سنسکرت کی اہمیت بڑھا چڑھا کر بتلائی گئی اور اُسے تین میں سے ایک لازمی زبان بنانے کا اشارہ دیا گیا ہے۔

نمبر ۱۴، اور ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ عصری تعلیم میں غیر شامل طلبا کے موانع کو دور کیا جائے گا، خواہ وہ کسی بھی قسم کے ہوں اور والدین کو راغب کر کے بل کہ مشروط امداد کر کے ان کے بچوں کو اسکول لایا جائے گا، نیز حاضری و پابندی کی نگرانی کی جائے گی۔

نمبر ۱۶، ۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ اس پالیسی کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے جدید تشکیل کردہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے ساتھ تعلیم، ثقافت، صحت اور تحقیق سے متعلق متعدد شعبوں کو جوڑ کر ان کی خدمات حاصل کی جائیں گی اور مطلوبہ بجٹ کو معیاری بنایا جائے گا۔

نمبر ۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ (تعلیمی پالیسی کا آغاز 2023 سے کیا جائے گا اور) ترجیحی بنیادوں پر مرحلہ وار نافذ کرتے ہوئے 40-2030 کی دہائی میں مکمل کر لیا جائے گا، اس کے بعد اس تجربے کی کامیابی کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔

قومی تعلیمی پالیسی اور مدارسِ دینیہ

۱) تین سے آٹھ سال کے بچوں کو بھی اسکول لانے کا انتظم کرنا۔

۲) تعلیمی نظام، نصاب اور مواد کو ملک گیر سطح پر یکساں کیا جانا۔

۳) ابتدائی درجات میں نصاب سے متعلق جو آزادی تھی اُس کا ختم کیا جانا۔

۴) آٹھ سے اٹھارہ سال تک کے تمام بچوں کا خواہ وہ کسی کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہوں اسکولی تعلیم میں شامل ہونے کو یقینی بنانا۔

۵) زائد عمر ہو جانے والے نوجوانوں کے لئے بھی کسی ذریعے سے بارھویں تک تعلیم دلانے انتظام کرنا۔

۶) اس کے لئے قانون حق لازمی تعلیم کا استعمال کیا جانا، نیز تعلیم کو بچہ کا پیدائشی حق بتا کر حقوقِ انسانی اور حقوقِ اطفال کی تنظیموں سے دباؤ ڈالنا۔

۷) تعلیم میں تنوع وشمولیت کی خاطر بیسیوں سرکاری محکمات اور سماجی تنظیموں سے مدد لیا جانا۔ اور

۸) نصاب ونظام دونوں پر بھگوا رنگ کا غالب رکھا جانا وغیرہ جیسے اُمور صاف بتلا رہے ہیں کہ دینی مدارس اس قومی پالیسی کے اثر سے محفوظ بالکل نہیں رہ پائیں گے، تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اس طویل منصوبے کو ملک گیر سطح پر نافذ کرنے کا کام وقت طلب اور بجٹ طلب ہے، اس میں کتنا وقت لگے گا بتلایا نہیں جا سکتا، مدرسوں میں زیر تعلیم طلبہ تک پہنچنے میں ممکن ہے اُنہیں دیر لگے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے متوجہ ہوں، بہ ہر صورت مدارسِ دینیہ کا قبل از قبل تیار رہنا اور ایک محفوظ نظام بنا کر ابھی سے کام شروع کر دینا بہت ضروری ہے، ایسی صورت میں حکومت کے مدارس کے نصاب ونظام میں مداخلت کے وقت ہمیں زیادہ حیران ہونا نہیں پڑے گا، نیز بچوں اور ان کے سرپرستوں کو مطمئن رکھا جا سکے گا کہ ہم خود سرکاری مطالبات کی تکمیل مدرسے کے اندر کر رہے ہیں، اس سے مدارس کے بند ہو جانے یا تعدادِ طلبہ کے گھٹ جانے کا خطرہ بہت کم ہو گا۔

باقی مدار کو بند کرنے، یا اُنہیں اسکول بنا دینے کی بات حکومت اس لئے نہیں کر رہی ہے کہ وہ دستوری حقوق سے متصادم ہے، اُن کا کہنا یہی ہو گا کہ ہمیں مذہبی تعلیم کے حق سے کوئی اختلاف نہیں لیکن ہر ہندوستانی بچے کو قانوناً عصری تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے، اس پر عمل کرا کے کچھ بھی پڑھا لو۔

قومی تعلیمی پالیسی اور اسکول انتظامیہ

علماء کرام کے لئے ایک اور اہم بات قابل غور یہ ہے کہ جو بچے مدارسِ دینیہ کے اندر ان علوم کو پڑھیں گے وہ تو نصاب ونظام کے مُضر اثرات سے ممکن حد تک محفوظ رہ سکیں گے، نیز زائد اسباب اختیار کر کے اُن کے

اذہان کی سلامتیٔ عقیدہ وفکر کی فکر کی جاسکتی ہے، لیکن جو مسلمان بچے بڑی تعداد میں سرکاری یا نجی اسکولوں میں تعلیم پائیں گے اُن کے دین وایمان اور ثقافتِ اسلامی کا کیا ہوگا؟ یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے مگر اس کے حوالے سے نہ معلوم کیوں اسکولوں کا مسلم انتظامیہ فکر مند نہیں ہے، کیوں اُنہیں اس قدر اطمینان حاصل ہے؟ ہوسکتا ہے کہ اُنہیں مضرات کا احساس ہی نہ ہو، یا مُضر ہی نہ سمجھتے ہوں، یا اس پالیسی کے بھی دوسرے اقدامات کی طرح سرد خانے میں پڑ جانے کا اطمینان رکھتے ہوں، جو بھی وجہ ہو اس طبقے میں اس مسئلے کو لے کر کوئی فکر اور کوئی ہلچل دکھائی نہیں دے رہی ہے جس کی جانب انہیں متوجہ اور چوکنّا کرنا علماء کرام کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

جدید تعلیمی پالیسی کو سمجھنے کی مذکورہ بالا سادہ سی کوشش کی روشنی میں درج ذیل سوالات پر غور کرنے کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے۔

۱) کیا اس کو عملاً نافذ ہونے سے سیاسی قوت کے ذریعے روکا جاسکتا ہے؟ جس کے بہ ظاہر کوئی آثار وامکان نہیں ہے۔

۲) کیا یہ بل بھی قانون حق لازمی تعلیم کی طرح سرد خانے میں پڑ جائے گا؟ کہ فی الحال مدارسِ دینیہ کو کسی تشویش میں پڑنا قبل از وقت سمجھا جائے۔

۳) کیا دیگر اقوام کو کوئی شکایت نہیں صرف مسلمان ہی اس کی زد میں ہیں؟ جس کا جواب ہاں میں ہے۔

۴) کیا مسلمانوں کے لئے اس سے بھی کوئی استثناء حاصل کیا جاسکتا ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی کیا گیا تھا۔

ان سوالات کے جوابات تو قائدینِ ملت وسیاست کی سرد مہری کو دیکھتے ہوئے نفی ہی میں ہوسکتا ہے، پس معلوم ہوا کہ اس کے نفاذ کے بعد تمام مسلم بچے اسی نظامِ تعلیم کے تحت تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہوجائیں گے، بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اس وجہ سے بھی مدارس دینیہ میں عصری تعلیم کی شمولیت ضروری ہے، جس سے مفر وانکار مشکل ہے، خلاصہ یہ کہ پہلا عامل تو داخلی اور دعوتی ضرورت پر مشتمل تھا، دوسرا جبری اور قانونی ضرورت کی بنیاد پر مشتمل ہے۔

میں نے مدارس میں عصری تعلیم کے دخول وشمول کے لئے جو دو وجوہات پیش کئے تھے ان میں سے ضرورت کے حوالے سے بہ قدر ضرورت عصری تعلیم تو بہ آسانی مدارسِ اسلامیہ میں داخل کی جاسکتی ہے، اس کا ایک سرسری خاکہ بھی حیدرآباد کے چند مدارس کے زیر نگرانی منتخب کمیٹی کے ذریعہ تیار کرلیا گیا ہے، بعض مدارس میں کسی حد تک عملاً شروع بھی کیا گیا ہے، اس کے لئے نصاب اپنی اپنی صواب دید سے مرتب کرلیا جاسکتا ہے، ایک جامع اور مختصر نصاب ملت فاؤنڈیشن اور ایم ایس اسکول کی مساعیٔ جمیلہ سے منظر عام پر آچکا ہے، اگر نظماءِ

مدارس اجتماعی طور پر یہ طئے کرتے ہیں کہ مدارس میں عصری تعلیم شامل کرنا ہے تو تھوڑی سی توجہ دینے سے اور دونوں تعلیم کے ماہرین کے ساتھ مِل بیٹھنے سے نظام بھی بن جائے گا نصاب بھی مل جائے گا، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ نصاب و نظام حکومت سے آزاد ہو۔

اور اگر خدانخواستہ حکومت کا جدید منصوبہ نافذ العمل ہوجاتا ہے اور ہر کسی کو اس کا پابند کردیا جاتا ہے تو یہ مسئلہ لازماً آسان نہ ہوگا جتنا کہ سمجھا جارہا ہے، مدرسہ کیا ہوگا ایک کچومر بن جائے گا، ساری روحانیت اور تمام تر ماحول بدل جاسکتا ہے تو اس صورت میں طریقۂ کار کیا ہونا چاہیئے، اس سلسلے میں ہمارے اکابر کو بہت بہت ہی سنجیدہ و متحدہ میٹینگیں کرنی ہوں گی بار بار کرنی ہوں گی اور قابل قبول و لائق تقلید لائحہ عمل اہلِ مدارس کے سامنے لانے ہوں گے اور ملکی سطح پر غور کرنا ہوگا۔ تاہم ضرورتِ دعوت و دفاع کے تحت جس طرح ممکن ہے عصری تعلیم کا آغاز بلا تاخیر شروع کردینا ہی اُمت کے حق میں بہتر ہے۔

بہ ہر حال آزادانہ طور پر عصری تعلیم حاصل کرنے کا مسئلہ ہو یا پابندِ قانون عصری تعلیم کی شمولیت کا معاملہ اہلِ مدارس کو درج ذیل دشواریاں پیش آئیں گی، جن کا حل نکال کے دینا بہت ضروری ہے۔

۱) مدارس میں طلبہ دینی تعلیم کے لئے کسی بھی عمر میں آتے ہیں اور علم دین کی اہمیت کے پیش نظر لے بھی لیا جاتا ہے، عصری نصاب کے ساتھ پڑھانے کی صورت میں اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا ہے؟

۲) بعض طلبہ اسکول کی کچھ کلاسس پڑھے ہوئے ہوتے ہیں بعض بالکل اَن پڑھ مدرسے میں آکر دینی تعلیم تو کم از کم حاصل کر لیتے ہیں، اس تفریق کو ختم کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ ایسے بچوں کو داخلہ ہی نہ دیا جائے یا انہیں بھی دونوں تعلیمیں دی جائیں، بڑی جگہوں میں تو داخلے میں عمر کی پابندی کرا سکتے ہیں مگر چھوٹے مقامات اور چھوٹے مدرسوں میں سب ملا کر چند طلبہ ہوتے ہیں ان کی جماعت بندی کیسے کی جاسکتی ہے؟

۳) دونوں تعلیموں کے ہونے کے لئے اسی حساب سے عمارت کلاسس اور جگہ کی ضرورت ہوگی، ہر مدرسہ اس کا نظم کیسے کرے گا، بہت سے مدارس بند ہوں گے، ان کے ذریعے جو قرآنی تعلیم ہورہی تھی وہ بھی ختم ہوجائے گی، جو بہت بڑا نقصان ہے، بڑے مدارس پھر بھی کچھ کر سکتے ہیں مگر چھوٹے مدرسوں کا ان پابندیوں کے ساتھ ترقی تو کیا بقا بھی مشکل ہے۔

۴) مدارس چندے سے چلتے ہیں، فیسیں بہت کم آتی ہیں، مدرسہ چاہے اسکول سے زیادہ تعلیم کیوں نہ دے لوگوں کا یہاں فیس دینے کا رجحان ہی نہیں ہے، دونوں تعلیم کی صورت میں بڑھتے اخراجات کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

۵) اساتذۂ مدارس معمولی وظیفوں پر خدمات انجام دے لیا کرتے تھے، ماسٹر صاحبان تو ایثار و قناعت سے کام نہیں لیں گے ان کے ہاں تصورِ تعلیم معیشت کا استحکام ہی ہے، اگر ان کو ان کے ڈیمانڈ کے مطابق وظیفہ دیا جائے تو ایک ہی ادارے میں تنخواہ کے یہ دو معیار کیوں کر چل سکیں گے جب کہ ایسا کرنا نامعقول بھی ہوگا بے مروّتی بھی۔

۶) عصری علوم کے جو اساتذہ رکھے جائیں گے ان کی استعداد کے علاوہ ان میں دینی جذبہ بھی دیکھنا ہوگا اور پہلے ہی بہتر ٹریننگ دینی ہوگی، پتہ چلا کہ بعض جگہ اساتذہ عصری تعلیم دیتے ہوئے سادہ لوحی سے بچوں کو اسی میں ترقی کرنے کے مشورے اور ترغیبیں بھی دیتے ہیں، تو یہ ٹیچرز خود مدارس کُش ثابت ہوں گے۔

۷) گورنمنٹ سے پرمیشن لینا ضروری ہوگا تو ان کی ہدایات کی پابندی بھی ضروری ہوگی تعطیلات اور وقتی ہدایات میں خود مدرسے کو بھی اسکول کے تابع کرنا پڑے گا۔ وغیرہ

یہ اور ان جیسے متعدد اُمور ہیں جن کا معقول جواب اور اطمینان بخش حل نکال کر نظماء مدارس کو جوڑا اور سمجھایا جائے تو اُن کے اندر مثبت تبدیلی آسکتی ہے، بہتر ہے کہ شوال ۱۴۴۳ھ سے کام کا آغاز کر دیا جائے کیوں کہ نظام کے درست ہوتے اور قابو میں آتے چند برس تو نکل ہی جائیں گے، ھذا ما عندی و انتم اعلم بھذہ المسئلۃ۔

والسلام علی النبی الکریم

(بقیہ صفحہ: ۸ سے)

تاکہ وہ فرائض امامت میں چوک سے بچ جائیں، اُنھیں ایسا علم اس کو عطا فرما جس سے نماز اعلیٰ درجہ کی پڑھا سکیں، اور لوگوں کو دینی اُمور میں صحیح راہ نمائی کر سکیں۔ اور مؤذنین کو دعا دی کہ ''اے اللہ! موذنین کی مغفرت فرما'' کیوں کہ اذان کی ذمہ داری میں کبھی اُن سے سہواً تقدیم و تاخیر کا صدور ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ائمہ و مؤذنین کو اپنی خدمات ذمہ داری سے ادا کرنے کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

گوشۂ سیرت

کیا تم میرے دوست کو ستانا نہیں چھوڑو گے؟

از: مولانا محمد الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی*

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجلس میں تشریف فرما ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آج صرف ابودرداءؓ ہی ہیں، اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ غصہ میں اپنی چادر کا ایک کونہ ہاتھ میں پکڑے آرہے ہیں اور ان کا گھٹنا کھلا ہوا ہے، ان کی اس حالت کو دیکھتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ آج ان کی کسی سے اَن بن ہوگئی ہے، جب وہ مجلس میں پہنچے تو سلام کے بعد کہنے لگے:

آج مجھ میں اور عمر بن خطاب میں کچھ سخت سست بات ہوگئی، پھر مجھے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے ان سے معافی مانگی، لیکن انھوں نے مجھے معاف نہیں کیا، اس لیے میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

اے ابوبکر! اللہ تم کو معاف کرے، یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین دفعہ دہرایا۔

ادھر عمر بن خطابؓ کو بھی جب اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تو وہ بھی دوڑے دوڑے معافی مانگنے صدیق اکبرؓ کے گھر پہنچے، لیکن وہ وہاں ان کو نہیں ملے تو سیدھے دربارِ نبوت میں پہنچ گئے، ان کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا جس پر صدیق اکبرؓ کو ڈر لگا کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمر کو ڈانٹ نہ دیں۔

اب مجلس میں دونوں دوزانو بیٹھے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ سرکار! مجھ ہی سے غلطی ہوگئی تھی، ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمر بن خطابؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

سنو! جب میری بعثت ہوئی تو شروع میں سب لوگوں نے مجھے جھٹلایا، صرف ابوبکر نے میری تصدیق کی، مجھ پر ایمان لائے اور اپنی جان و مال کو مجھ پر نچھاور کر دیا، کیا تم میرے اس دوست کو ستانا نہیں چھوڑو گے؟!

یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ دہرایا۔ (صحیح البخاری کتاب المناقب: ۳۶۶۱)

(ماخوذ از مجالس نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفحہ: ۱۵۷)

* استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ بھٹکل

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب: حلیمہ نام، والد کا نام ابوذؤیب عبداللہ بن حارث اور شوہر کا نام حارث بن عبد العزیٰ بن رفاعہ تھا، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کا تعلق قبیلہ سعد بن بکر سے تھا، جو قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ اور فصاحت و بلاغت نیز اپنے علاقے میں پانی کی شیرینی کے سبب مشہور تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میں تمام عرب میں سب سے فصیح ہوں ایک تو ہمارا قبیلہ قریش فصاحت و بلاغت میں نمایاں اور ممتاز رہا ہے، دوسرے میری پرورش قبیلہ بنی سعد میں ہوئی جو عرب میں فصاحت و بلاغت میں بے مثل اور مشہور تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی رضاعت میں

اس زمانے کا دستور تھا کہ لوگ اپنے بچوں کو پرورش کے لئے دوسروں کو دیتے تھے اور قریبی قبائل اور دیہاتوں میں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ وہاں کی کھلی آب و ہوا اُن کو میسر آئے، پھر چند سال کے بعد بعد بچے والدین کے پاس واپس کر دیئے جاتے، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گاؤں دیہات کی غریب عورتیں امراء کے بچوں کی پرورش کے لیے شہر آتیں اور بچوں کو لے جاتیں، چنانچہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے قبیلہ بنی سعد بن بکر کی دوسری دس عورتوں کے ساتھ مکہ آئیں کہ بچوں کو پرورش کی غرض سے لے جایا جائے، سب عورتوں نے بچے لے لئے، صرف حضرت حلیمہ سعدیہؓ رہ گئیں، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کیا گیا تو کہنے لگیں: يتيم لا مال له و ما عست أمه أن تفعل (یتیم بے مال ومنال، ان کی ماں کیا کریں گی) قبیلہ کی تمام عورتیں حلیمہ رضی اللہ عنہا کو چھوڑ کر چلی گئیں، حضرت حلیمہؓ نے اپنے شوہر سے کہا: آپ کی کیا رائے ہے؟ میری سہیلیاں تو چلی گئیں اور مکہ میں دودھ پلانے کے لئے سوائے اس یتیم بچے کے کوئی نہیں ہے تو شوہر نے کہا: مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ خالی ہاتھ اپنے گھر واپس چلے جائیں، ہوسکتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اسی لڑکے میں ہمارے لئے بہتری رکھی ہو۔ حضرت حلیمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ کے پاس واپس آکر بچے کو

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دارالعلوم دیودرگ

اپنی آغوش میں لینے کی تمنا ظاہر کی، جیسے ہی چھاتی سے لگایا چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں، جب کہ اس سے پہلے چھاتیاں بالکل خالی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسودہ ہوکر پیا، آپ کے دودھ شریک بھائی نے بھی پیا اس سے پہلے اس کی یہ حالت تھی کہ وہ بھوک کی وجہ سے سو نہیں سکتا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ محترمہ نے حلیمہؓ سے فرمایا: میرے اس بچہ کے متعلق باخبر رہنا کہ عنقریب اس کی ایک شان ہوگی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ محترمہ نے حضرت حلیمہؓ کو اس نومولود کے متعلق وقت ولادت پیش آمدہ تمام احوال وواقعات کہہ سنائے اور یہ بھی کہا کہ: مجھ سے تین شب مسلسل یہ کہا گیا کہ اپنے بچے کو اولاً قبیلہ بنو سعد بن بکر اور پھر آل ابوذؤیب میں دودھ پلواؤں، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میرے اس بچے کا باپ ہی ابوذؤیب ہے، جو میرا شوہر ہے۔

حضرت حلیمہؓ کی بنوسعد روانگی:

حضرت حلیمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر نہایت خوش وخرم اپنے فرودگاہ پہنچی، گدھی پر اسباب وکجاوہ رکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ساتھ لئے بیٹھ گئیں، آگے حارث بیٹھے اور سواری چلی ''وادی السرر'' میں سہیلیوں سے ملاقات ہوئی ، انہوں نے دریافت کیا کہ کیا ہوا: تو جواب دیا'' أخذت واللہ خیر مولود رأیته قط وأعظمهم برکة '' (خدا کی قسم! جتنے بچے میں نے دیکھے ان سب میں بہترین مولود وبزرگ ترین برکت والے کو میں نے لیا ہے) عورتوں نے کہا: وہ عبدالمطلب کا پوتا؟ حلیمہ نے کہا: ہاں، صورتحال کو دیکھ کر سہلیاں حسد کرنے لگیں؟ حلیمہ کہتی ہیں کہ جب مکہ سے چلے تھے تو ہمارا گدھا مریل تھا، جو سارے قافلے کے پیچھے چلتا تھا، ایسی تیز رفتاری سے چلا کہ سارے قافلہ سے آگے نکل گیا، جس کی وجہ سے میرے خاوند اور قافلہ کے دوسرے لوگ کہتے تھے یہ بچہ نہایت برکت والا ہے'' یا حلیمه ، واللہ انی لأراک أخذت نسمة مبارکة'' گھر پہنچی تو بکریوں کے تھن دودھ سے بھر گئے، گاؤں کے دوسرے جانوروں کے تھن خشک تھے، حلیمہ کہتی ہیں کہ لوگ ہماری حالت پر رشک کرتے تھے، ہمارے جانوروں کے ساتھ چرنے کی وجہ سے ان کے جانوروں کے تھن بھی دودھ سے بھر گئے۔'' وجادت شارفها باللبن بعد أن کانت لا تروی ناهلا، وأسرعت أتانها فی السیر وقد کانت ثاقلا، وأخصبت بلادها وکانت قبل ذلک ماحلا''

(حدائق الانوار فی سیرۃ النبی المختار: ۱/۵۵، دار المنهاج، جده، الطبقات الکبری لابن سعد ۱/۸۹، دار الکتب العلمیة، بیروت)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حلیمہؓ کے گھر میں:

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو برس تک قبیلۂ بنوسعد میں رہے، دودھ چھڑایا گیا تو ایسا معلوم ہوا کہ آپ چار برس کے ہیں، حضرت حلیمہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ سے ملانے ان کو لے چلیں، حضرت حلیمہؓ نے ان سے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام احوال وواقعات اوران کی برکتوں کا تذکرہ کیا تو حضرت آمنہ نے کہا: میرے بچے کو واپس لے جاؤ، مجھے مکہ کی وبا سے ڈر لگتا ہے، خدا کی قسم اس کی ایک خاص شان ہوگی۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار برس کے ہوئے تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ قریب ہی ایک جگہ تشریف لے جاتے تھے، ایک دفعہ وہاں پر شق صدر کا واقعہ پیش آیا، دو فرشتے وہاں آئے اورانہوں نے آپ کے شکم مبارک کو چیر کر ایک سیاہ نقطہ اس میں سے نکال کر پھینک دیا اور سونے کے ایک طشت میں رکھ کر اس کو برف آب سے دھویا، پھر امت کے ایک ہزار آدمیوں کے برابر میں آپ کو تولا تو آپ ہی بھاری اور وزنی ہوئے، اس وقت فرشتوں نے کہا: ''دعه فلو وزن بامته کلها لوزنهم'' (چھوڑ دو اگر ان کو ان کی تمام امت سمیت وزن کیا جائے تو آپ کا ہی پلہ بھاری ہوگا)۔

بھائی چیختے چلاتے گھر آئے ماں کو اطلاع دی کہ ''ادرکی أخی القرشی'' میرے قریشی بھائی کی خبر لو' حلیمہؓ اپنے شوہر کے ساتھ دوڑی ہوئی آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنگ فق پڑ گیا تھا، پھر والدہ محترمہ آمنہ کے پاس ڈرتے سہمتے ہوئے لے آئیں اور ساری کیفیات کہہ سنائیں کہ ''انا لا نرده الا علی جلع آنفنا'' (شاید کہ ہم اس بچے کو اپنی ناک کٹائے بغیر واپس نہیں کریں گے)۔

(الطبقات الکبری لابن سعد ۱/ ۹۰، دار الکتب العلمیة، بیروت)

پھر اس کے بعد والدہ کے اصرار پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس لے آئیں، اور ایک سال یا اس کے قریب (واقعہ شق صدر کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی آغوش تربیت میں ہی رہے۔ لیکن اس کے بعد حضرت حلیمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دور جانے نہ دیتی تھیں۔

ایک دفعہ حضرت حلیمہؓ نے دیکھا کہ ایک ابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سایہ گستر ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہر جاتے ہیں تو وہ بھی ٹھہر جاتا ہے، اور چلتے ہیں تو وہ بھی چلتا ہے، حلیمہؓ اس بات سے بھی ڈر گئیں پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو والدہ کی خدمت میں لے آئیں، مکہ کے قریب پہنچی تو لوگوں کے مجمع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گم ہو گئے نہ پایا تو عبد المطلب کو خبر دی، عبد المطلب کو تلاش وجستجو کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ ملے تو کعبہ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

اللّٰھم اد راکبی محمدا اده الیّ واصطنع عند بدا

اے اللہ! میرے شہسوار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجھے دے دے، اسے مجھ کو دے، میرے پاس بھیج دے اور عنایت کی بدولت مجھ پر اپنا فضل وکرم فرما۔ پھر تھوڑی دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آ گئے تو عبد المطلب نے پوتے کو گلے سے لگالیا اور کہا: اب میں تجھے کسی ضرورت سے نہیں بھیجوں گا۔

ایک دفعہ مدت رضاعت میں کچھ یہودیوں کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے ہوا، ان سے حلیمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میرے اس بچے کی نسبت تم مجھے کچھ باتیں نہیں بتاتے، یہ شکم میں رہا، پیدا ہوا تو یوں پیدا ہوا، انہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ کی تمام باتیں ان سے کہہ سنائیں ایک یہودی نے ان میں سے کہا: ''اقتلوہ'' (اس کو قتل کردو) دوسرے نے کہا: ''أیتیم ھو'' (کیا یہ بچہ یتیم ہے؟) حلیمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نہیں! (اپنے شوہر کی جانب اشارہ کرکے) بتلایا یہ اس کا باپ ہے، اور میں اس کی ماں ہوں، سب نے کہا: ''لو کان یتیما لقتلناہ'' (اگر یہ بچہ یتیم ہوتا تو ہم اس کو قتل کرڈالتے)۔ (الطبقات الکبری لابن سعد ۱/ ۲۹، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کا احترام

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا ایک دفعہ زمانہ قحط میں مکہ پہنچیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: ''میری ماں! میری ماں! اپنی چادران کے لئے بچھادی کہ وہ اس پر بیٹھ جائیں، اس زمانے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا تھا، حلیمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قحط وگرانی اور مویشیوں کی ہلاکت کا ذکر کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو انہوں نے حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کو چالیس بکریاں اور سواری کے لئے ایک اونٹ عنایت کیا جو ساز وسامان سے لدا ہوا تھا، یہ سب لے کر حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا اپنے اہل وعیال کے پاس واپس چلی گئیں۔ (اسد الغابۃ، سلمٰی بنت ابی ذؤیب)

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کا قبولِ اسلام:

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا گاہے گاہے خدمت اقدس میں حاضر ہوتی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا نہایت اعزاز واکرام فرماتے اور احسان ومحبت سے پیش آتے، کتب سیر حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے قبولِ اسلام اور شرفِ صحابیت کے بارے میں خاموش ہیں، لیکن قرائن سے یہی معلوم ہتا ہے وہ شرف اسلام وصحابیت سے ضرور مشرف ہوئی ہوں گی، امام سہیلی نے ''روضۃ الانف'' میں صراحت کی ہے کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حارث بن عبد العزی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ایک دفعہ مکہ آئے اور اسلام قبول کیا، اور اسلام پر خوب ثابت قدم رہے، شوہر کے قبول اسلام کے بعد ظاہر ہے کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا نے بھی قبول اسلام کیا ہو۔ (الروض الأنف: ۷، ۵۷۵، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

وفات:

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی سن وفات کے سلسلے میں کتب سیر میں کہیں کوئی صراحت نہیں ملتی۔

(السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: ۳/ ۶۹۰، دار المعرفۃ، بیروت)

گوشۂ خواتین

اُمِّ ابراھیمؓ حضرت ماریہ قِبطیہؓ

از: مولانا سراج احمد قاسمی زید مجدہٗ*

حضور ﷺ کا گرامی نامہ بادشاہِ مصر کے نام:

حضورِ اکرم ﷺ ۶ ؁ھ کے اخیر میں حدیبیہ سے واپس تشریف لائے تو مختلف بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط لکھے اور خیبر روانہ ہونے سے چند دن پہلے یکم محرم ۷ ؁ھ کو معلومات رکھنے والے تجربہ کار صحابہؓ کے ہاتھوں یہ خطوط روانہ فرمائے، ایک خط حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو دے کر مصر و اسکندریہ کے بادشاہ کے پاس بھیجے، اِس کا نام جریج بن متیٰ یا بنیامین اور اس کا لقب ''مُقَوْقِس'' تھا، عیسائیت پر یقین رکھتا تھا۔

حضورِ اکرم ﷺ کے قاصد حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ خط لے کر جب مقوقس کے پاس پہنچے تو اُس نے بڑے ادب و وقار سے خط لیا اور پڑھا، اعزاز و اکرام کے ساتھ حضرت حاطبؓ کو اپنے مہمان خانہ میں ٹھہرایا، مقوقس نے ایک دن اپنے سرداروں اور علماء و دانشوروں کو جمع کیا، پھر اُن سب کے سامنے حضرت حاطبؓ کو بلا کر کہا کہ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں سمجھ کر جواب دینا، اُس نے کچھ سوالات کئے جن کا حضرت حاطبؓ نے دانشمندانہ اور داعیانہ انداز میں جواب دیا، جواب سن کر بادشاہ خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت حاطبؓ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے ایک تقریر کی، اس سے بادشاہ بہت متأثر ہوا اور اس کا اقرار کیا کہ آپ ﷺ کاہن، جادوگر، گمراہ اور جھوٹے نہیں ہیں، نبوت کی علامتیں آپ ﷺ کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر بادشاہ مقوقس نے ایمان قبول نہیں کیا۔ حضورِ اکرم ﷺ کے خط کو ادب و احترام کے ساتھ ہاتھی دانت سے بنے ایک ڈبیہ میں رکھ کر اور مہر لگا کر اپنے خازن کو حکم دیا کہ حفاظت سے رکھو، پھر ایک لکھنے والے کو بلا کر حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کے خط کا عربی میں یہ جواب لکھوایا۔

بادشاہ مصر کا جواب اور اس کے بھیجے ہوئے ہدایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ خط محمد بن عبد اللہ کے لئے مقوقس بادشاہ قِبط کی جانب سے: سلام ہو آپ ﷺ پر اما بعد: میں نے

---

* مدرسہ مدینۃ العلوم، صدر، ناگپور

آپ ﷺ کا خط پڑھا، اُس کے مضمون کو اور اُس چیز کو جس کی طرف آپ ﷺ نے دعوت دی ہے سمجھا، میں یقین سے جانتا ہوں کہ ایک نبی کا آنا باقی رہ گیا ہے، میرا گمان یہ تھا کہ شاید وہ ملک شام میں ظاہر ہوں، میں نے آپ ﷺ کے قاصد (خط لانے والے) کا اکرام واحترام کیا، دو باندیاں، کچھ کپڑے اور ایک خچر ہدیہ کے طور پر آپ اکی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ والسلام

حضور ﷺ کی خدمت میں بادشاہ مصر نے جو ہدایا بھیجے ان کی تفصیل سیرت کی دوسری کتابوں میں اس طرح ملتی ہے۔

(۱) تین باندیاں، حضرت ماریہؓ، حضرت سیرینؓ، حضرت قنسرینؓ۔ (بیہقی فی دلائل النبوۃ)

(۲) ایک خچر جس کا نام دُلدُل تھا، اس کا رنگ سفید سیاہی مائل تھا، غزوۂ حنین میں آپ ﷺ اسی پر سوار تھے، آپ ﷺ کی وفات کے بعد یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سواری میں رہا، زادالمعاد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خچر حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ تک باقی رہا۔

(۳) ایک ہزار دینار (سونے کا سکہ، اشرفی) زادالمعاد میں ایک ہزار مثقال سونا لکھا ہوا ہے، مگر ایک دینار بھی عام طور سے ایک مثقال کا ہوتا تھا۔

(۴) نرم وملائم قباطی کپڑوں کے بیس جوڑے یا تھان۔

(۵) بنھا کا شہد اور خوشبو، کانچ کا ایک پیالہ جس میں آپ ﷺ پینے کی چیزیں نوش فرماتے تھے، اور ایک گھوڑا جس کا نام مزاز تھا۔ (تاریخ اسلام حصہ سوم از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ)

(۶) حضرت ماریہؓ کا مابور نام کا ایک بوڑھا بھائی تھا، اُسے بھی مقوقس نے ان سب کے ساتھ مدینہ روانہ کیا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۸)

مقوقس نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک ماہر طبیب بھی بھیجا تھا تا کہ وہ آپ ﷺ اور دیگر مریضوں کا علاج کرے، مگر آپ ﷺ نے فرمایا تم واپس چلے جاؤ، ہم لوگ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتے جب تک ہمیں بھوک نہ لگے اور کھاتے وقت بھی سیر ہو کر نہیں کھاتے لہٰذا ہمیں طبیب اور معالج کی ضرورت نہیں۔

(الطبقات الکبریٰ، ۱/۲۶۰)

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ بادشاہِ مصر مقوقس کے پاس پانچ دن قیام کئے اور پھر اُس کا خط اور ہدیہ کے سب ساز وسامان لے کر مصر سے مدینہ روانہ ہوئے، راستہ میں انھوں نے حضرت ماریہؓ اور ان کی بہنوں اور بھائی مابور پر اسلام پیش کیا، اسلام کی خوبیاں اور محاسن سمجھائے، جس کی وجہ سے حضرت ماریہؓ اور ان کی بہنیں

اسلام قبول کرلیں مگر ان کا بھائی مابور عیسائیت پر ہی قائم رہا۔ بعد میں وہ بھی زمانۂ رسالتؐ میں ہی اسلام قبول کر لئے تھے، اسی لئے محدثین اور سیرت نگاران کا شمار اہل کتاب صحابہؓ میں کرتے ہیں، یہ حضرت ماریہؓ سے بہت قریب اور مانوس تھے، مدینہ میں رہتے ہوئے حضرت ماریہؓ کا گھریلو کام کاج کر دیتے تھے اور پانی بھر کر لا دیتے تھے۔

حضرت ماریہؓ اور ان کی بہنیں:

حضرت ماریہؓ کی ولادت مصر کے ایک شہر اَنْصِنا کے قریب ''حَفْن'' نام کے گاؤں میں ہوئی تھی، اِن کے والد ایک قبطی شخص تھے جن کا نام شمعون تھا، اور ماں ایک مسیحی رومی عورت تھیں، حضرت ماریہؓ اپنی شروع جوانی میں اپنی بہن سیرین کے ساتھ مصر کے بادشاہ مقوقس کے محل میں پہنچ گئیں، پھر ان کی قسمت کا ستارہ مزید چمکا کہ وہ اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل ہوئیں اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ پہنچیں۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ بادشاہ مصر کا خط اور ہدایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے، اور مقوقس سے جو بات ہوئی اس کی تفصیل بھی بتائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نادان نے اپنی بادشاہت کی وجہ سے بخیلی کی، حالاں کہ اُس کی بادشاہت باقی نہ رہے گی۔ مقوقس نے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی (مدارج النبوۃ جلد دوم) حضرت سیرینؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابتؓ شاعر اسلام و دربار نبوت کے سپرد فرمایا اور حضرت قنسرینؓ کو حضرت دحیہ کلبیؓ کے حوالے کیا۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملکیت یمین کے تحت اپنے حرم میں داخل فرمایا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ماریہؓ کو پہلے ہمارے پڑوس میں حضرت حارثہ بن نعمانؓ کے مکان میں ٹھہرایا گیا اور ہم لوگ برابر ماریہؓ کے پاس آیا جایا کرتے تھے لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد و رفت ماریہؓ کے پاس زیادہ ہونے لگی تو ہم لوگوں نے اُن کے پاس آنا جانا کم کر دیا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سکون میں فرق نہ آئے) اس کے بعد وہ تنہائی کی وجہ سے گھبرانے لگیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماریہؓ کے لئے مدینہ کے قریب عالیہ نام کی بستی میں ٹھہرنے کا انتظام کیا، جسے اَب مشربۂ ابراہیم کہا جاتا ہے۔

(فتح الباری جلد ۸، صفحہ ۵۱۳۔ بحوالہ سیر الصحابہ جلد ۶)

حضرت علامہ شبلی نعمانی صاحبؒ نے سیرت النبیؐ جلد اول میں تاریخ طبری کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ: ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا۔ اُن کی تعلیم سے دونوں خاتون خدمت نبوی میں پہنچنے سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس

واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہئے کہ یہ دونوں خاتون باندیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کرچکی تھیں، اِس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا، نہ کہ باندی کی حیثیت سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم میں آئیں۔

(سیرت النبیؐ جلد اول، صفحہ ۲۶۸)

صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ کی ولادت:

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماریہؓ کو پردہ کرنے کا حکم فرمایا اور اُن کے پاس آیا جایا کرتے تھے، حضرت ماریہؓ اپنے سے پہلے اِس علاقہ میں آنے والی سیدہ مصر حضرت ھاجرہؓ کے بارے میں مسلسل سوچا کرتی تھیں، جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے نکاح میں آئیں اور پھر اُن کے بطن سے اسماعیلؑ کی پیدائش ہوئی، آگے چل کر یہ بھی نبوت سے نوازے گئے۔ جب حضرت ماریہؓ نے حمل کے کچھ آثار محسوس کئے تو اُن کے دل میں یہ تمنا اور آرزو کروٹ لینے لگی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے کی ماں بنیں جیسے کہ حضرت ہاجرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کی ماں بنی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی حفاظت اور دیکھ ریکھ کے لئے رات کو جاگتے، اسی طرح حضرت ماریہؓ کی بہن حضرت سیرین بھی اِن کی بہت خدمت اور دیکھ بھال کرتی تھیں۔ جب بچہ اپنے وقت مقررہ تک پہنچ گیا اور ماہ ذی الحجہ کی ایک رات ولادت کی گھڑی قریب آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام ابورافع کی بیوی سلمٰی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ کی باندی بھی تھیں اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے تمام بچوں کی ولادت کے وقت دایہ کی ذمہ داری نبھائی تھیں، اُن کو دایہ کی خدمت انجام دینے کے لئے بلایا اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر کے ایک گوشہ میں نماز پڑھنے اور دعا کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں ام رافع یعنی سلمٰیؓ بچہ کے پیدائش کی خوشخبری سنائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلدی سے حضرت ماریہؓ کے پاس گئے، اُن کو مبارکباد دی۔ بچہ کو گود میں لے کر برکت کی دعا فرمائی۔ سیرت النبیؐ علامہ شبلیؒ میں ہے کہ ابورافع نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچہ کی ولادت کی خوشخبری سنائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے صلہ میں ایک غلام عطا فرمایا، ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بال کے برابر چاندی خیرات کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر نام رکھا، رضاعت یعنی دودھ پلانے کی خدمت کے لئے تمام انصار کی عورتوں نے خواہش ظاہر کی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خدمت حضرت ام بردہ خولہ بنت زید الانصاری کے سپرد فرمائی اور اس کے معاوضہ میں کھجور کے چند درخت دیئے۔ بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خدمت ام سیفؓ کے متعلق کی، قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں۔ ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے اور وہ ابوسیف کی کنیت سے مشہور ہیں، ان کا خاندانی پیشہ لوہار کا تھا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا رات کو میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام میں نے اپنے باپ ابراہیمؑ کا نام رکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ لڑکا اُمِ سیف کو دیا جو لوہار کی عورت تھیں اور لوہار کا نام ابوسیف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز ابوسیف کے گھر چلے تو میں بھی ساتھ ہو گیا، جب ہم ابوسیف کے گھر کے قریب پہنچے تو وہ اپنی بھٹی دھونک رہے تھے، سارا گھر دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ میں دوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے گیا اور کہا کہ اے ابوسیف! ذرا ٹھہر جا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ وہ ٹھہر گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچہ کو طلب فرمایا اور اپنے سے چمٹا لیا اور جو اللہ کو منظور تھا وہ آپ نے فرمایا۔ بخاری میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیار کیا، بوسہ لیا اور سونگھا (یعنی اپنا منہ اور ناک اُن کے منہ پر اس طرح رکھے جیسے کوئی خوشبو سونگھتا ہے)۔

(مسلم جلد ۲، کتاب الفضائل۔ بخاری جلد اول، کتاب الجنائز)

صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ کی وفات: حضرت ماریہؓ کو یہ خیال ہو چلا کہ اب ان کی تمنا پوری ہو چکی ہے، اس لئے کہ ان کے بطن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیمؓ پیدا ہوئے ہیں، جیسے کہ اِن سے پہلے مصر کی رہنے والی اور قبطی نسل سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے، لیکن اُن کی یہ خوشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ حضرت ابراہیمؓ اکثر بیمار ہو جایا کرتے تھے اور ابھی اپنی عمر کے دو سال بھی نہیں مکمل کئے تھے کہ اسی بیماری میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابراہیمؓ کے نزع کی حالت میں ہونے کی خبر دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوسیف کے گھر تشریف لائے، دیکھا کہ حضرت ابراہیمؓ دَم توڑ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، عبدالرحمن بن عوفؓ بولے! یا رسول اللہ! آپ بھی لوگوں کی طرح بے صبری کرنے لگے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے عوف کے بیٹے! یہ بے صبری نہیں بلکہ رحمت ہے، پھر دوسری بار روئے اور فرمایا: اِنَّ الْعَینَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزَنُ وَ لَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضیٰ رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاھِیمُ لَمحزُوْنُوْنَ۔ (بخاری جلد ا، کتاب الجنائز) آنکھ روتی ہے اور دل غمگین و رنجیدہ ہے، زبان سے ہم وہی کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہوتا ہے اور بیشک اے ابراہیمؓ! ہم تمھاری جدائی سے غمگین ہیں۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ رحمۃ اللعالمین کی جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب آخری وقت میں اُن کو دیکھا تو وہ (ابراہیمؓ) سانس چھوڑ رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو گود میں اٹھایا اور زبان سے فرمایا: اے ابراہیم! حکمِ الٰہی کے سامنے ہم تیرے کس کام آسکتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ موت تو اَمرِ حق ہے اور وعدہ صدق ہے، ہم جانتے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والے بھی پہلے جانے والوں کے ساتھ جا ملیں گے،

اگر ایسا نہ ہوتا تب ہم ابراہیم کا غم اس سے بھی زیادہ کرتے، آنکھ میں آنسو ہے، دل میں غم ہے مگر ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں گے جو رب کو ناپسند ہو۔

۱۶ یا ۱۷ ماہ کی عمر میں صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہوا، لختِ جگر کی جدائی سے حضرت ماریہؓ بے قابو ہو کر رونے لگیں تو ان کی بہن حضرت سیرینؓ جو بڑی شاکرہ وصابرہ تھیں، انہوں نے اپنی بہن کو بڑا سنبھالا دیا، سمجھاتی رہیں، اگرچہ انھیں بھی اپنی محبوب بہن کے بچہ کے مرنے کا غم کم نہ تھا مگر انھوں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ماریہؓ کی طرف شفقت وتعزیت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں: ابراھیم میرا بیٹا ہے وہ دودھ پیتے ہوئے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا، اب اس کے لئے جنت میں دو دُودھ پلانے والیاں ہیں، جو اُس کو دودھ پینے کی مدت پوری ہونے تک دُودھ پلائیں گی۔ (مسلم شریف، کتاب الجنائز)

تجہیز وتکفین: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت فضل بن عباسؓ نے بچہ کو غسل دیا اور کفن پہنائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریب ہی بیٹھے تھے، چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی، حضرت عثمان بن مظعونؓ کی قبر کے قریب حضرت ابراہیمؓ کو دفن کیا گیا، قبر میں حضرت فضل بن عباسؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ اترے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں حضرت عباسؓ بھی بیٹھے تھے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبر بند کرنے کے لئے لگائی جانے والی کچی اینٹوں کے درمیان کچھ خلا محسوس کیا، تو فرمایا کہ اِسے بند کردو، پوچھا گیا کیا یہ ضروری ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چیز نہ نقصان دیتی ہے اور نہ نفع پہنچاتی ہے، البتہ آنکھوں کو ٹھنڈا کر دیتی ہے، بندہ جب کوئی کام کرے تو اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ وہ اُسے اچھی طرح کرے۔ (طبقات ابن سعد ۸)

حضرت جعفر بن محمدؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبر پر تین لپ بھر کر مٹی ڈالے اور اپنے صاحبزادہ ابراہیمؓ کی قبر پر پانی چھڑکا اور (نشانی کے لئے) اُس پر کنکر رکھوائے۔

(رواہ فی شرح السنۃ، مشکوٰۃ باب دفن المیت)

صاحبزدہ ابراہیمؓ کا انتقال اور سورج کو گرہن لگنا:

مشہور ماہر فلکیات علامہ محمود پاشا مصری نے قواعد ریاضیہ کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں صرف ایک بار سورج گرہن ہونا ثابت کیا ہے، البتہ چاند گرہن کا واقعہ کئی مرتبہ ہوا ہے، اکثر علماء کا بھی یہی قول ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جب ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا تو اتفاق سے اُس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے صاحبزادہ حضرت ابرہیمؓ کا انتقال ہوا تھا، یہ ۱۰ھ کی بات ہے، زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ چاند یا سورج کا گرہن کسی بڑے آدمی کی موت کی وجہ سے ہوتا ہے، صاحبزادہ ابراہیمؓ کی اُس دن وفات کی وجہ سے زمانہ جاہلیت کے اس عقیدہ کو تقویت مل سکتی تھی، چنانچہ نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والے اور کمزور ایمان رکھنے والے مسلمانوں نے کہنا بھی شروع کر دیا کہ ابراہیمؓ کے انتقال کی وجہ سے سورج کو گرہن لگا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب صاحبزادہ ابرہیمؓ کی نمازِ جنازہ اور کفن دفن سے فارغ ہوئے تو اپنا غم بھلا کر فوراً اُمّت کے عقیدہ کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ ایک شخص کو بھیجا گیا کہ وہ لوگوں کو جمع ہونے کے لئے آواز لگائے، جب لوگ جمع ہو گئے تو دو رکعت نماز سورج گرہن کی نیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جماعت کے ساتھ اتنی لمبی پڑھائے کہ گرہن ختم ہو کر سورج روشن ہو چکا تھا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے طویل خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں زمانۂ جاہلیت کے عقیدہ کی سختی سے رد کرتے ہوئے فرمایا: سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان میں نہ کسی کے مرنے کی وجہ سے گرہن لگتا ہے اور نہ کسی کی موت کی وجہ سے۔ جب تم دیکھو کہ انھیں گرہن لگ گیا ہے تو اللہ سے دعا کرو، اللہ کی بڑائی بیان کرو اور نماز پڑھو نیز اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرو۔ (مشکوٰۃ، باب صلوٰۃ الخسوف)

وفات: حضرت ابراہیمؓ کی وفات ۲۹ شوال المکرم ۱۰ھ کو ہوئی، حضرت ماریہ قبطیہؓ اپنے بیٹے کی وفات کا غم ابھی بھولی نہ تھیں کہ بیٹے کی وفات کے چار ماہ بارہ دن بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات ہونے سے آپؓ کو دوہرا رنج وغم سہنا پڑا۔ اس کے بعد حضرت ماریہ قبطیہؓ پانچ سال تک حیات رہیں، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت یا پھر اپنے بیٹے کی قبر کی زیارت کے لئے گھر سے باہر نکلتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُن کا اعزاز واحترام باقی رکھا اور ہمیشہ اُن کے نان ونفقہ کا خیال کرتے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اُن کے ساتھ یہی سلوک برقرار رکھا اور انھیں کے زمانہ خلافت میں ماہ محرم ۱۶ھ کو حضرت ماریہ قبطیہؓ کی وفات ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو جب ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے خود تمام اہل مدینہ کو جمع کیا اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر حضرت ماریہؓ کو مدینہ کے عام قبرستان جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

☆☆☆☆☆

اصلاحی مضامین

القاب کا استعمال اور ہماری بے اعتدالیاں

از: محمد ندیم الدین قاسمی*

"اعتدال"؛ دینِ اسلام ہی کا خاصہ، اورامتِ محمدیہ کا امتیازی وصف ہے، جوانسانی زندگی کے تمام شعبوں میں مطلوب ہے، خواہ وہ عبادات ہوں یا عادات، جذبات ہوں یا افکاروخیالات؛ حتی کہ کسی کی مدح سرائی ہو یا کسی پر تنقید وتبصرہ؛ ہر ایک میں میانہ روی اوراعتدال کی تعلیم دی گئی ہے؛ لیکن آج ہم اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ تعریف وتنقید دونوں شعبوں میں عوام تو عوام، خواص کا ایک بڑا طبقہ افراط وتفریط کا شکار ہے، بعضوں نے تو کسی کی تعریف کو شجرِ ممنوعہ، فعلِ حرام اور معصیتِ رب سمجھ رکھا ہے، دوسروں کے محاسن ومحامد کا اظہار تو دور کی بات، دوسروں کی معمولی خامیوں اور کوتاہیوں کو موضوعِ بحث بنانا ان کا شیوہ ہے، اورخود ان کا حال یہ ہے کہ" ہم چوں دیگرے نیست" کے خول میں بند ہیں، اپنی تقصیر وکوتاہی کو کمال وہنر جانتے ہیں؛ جب کہ حسنِ کارکردگی پر تعریف، ہونہار اور قابل افراد کے جذبۂ عمل کو مہمیز کرتی ہے، تعریف سے حوصلے پروان چڑھتے ہیں، ارادوں میں شبابی شان پیدا ہوتی ہے، نیز اسوۂ رسول ﷺ سے بھی ہمیں اس کا سبق ملتا ہے: جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا: والذي نفسي بيده ما لقيك الشيطانُ قطّ سالكا فجا إلا سلك فجا غير فجك۔ (صحیح مسلم ۲۳۹۶) ترجمہ: بہ خدا! جب بھی شیطان تمھیں کسی راستہ میں ملتا ہے تو راستہ بدل لیتا ہے۔

اور حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِن مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لا نَبِيَّ بَعْدِي (صحیح بخاری ۳۷۰۶) ترجمہ: تمہارا مقام میرے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے حضرت ہارونؑ کا مقام حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھا؛ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

وہیں دوسری طرف تعریف وتوصیف میں مبالغہ آرائیاں، کوہ پیما جملے، شاہانہ تعبیرات، مذہبی القابات میں آئے دن جو بے اعتدالیاں سامنے آرہی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، رائی کو پربت، قطرے کو سمندر، ذرے کو پہاڑ

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

بنا کر پیش کرنے کا مزاج تو عام سا ہو گیا ہے، جلسوں اور دیگر مجالس میں آئے روز علماء و اکابر کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے جاتے ہیں؛ مثلاً کسی کے لیے حجۃ الاسلام، تو کسی کے لیے شیخ الاسلام، کسی کے لیے شیخ الفقہ، تو کسی کے لیے شیخ الحدیث، کسی کے لیے مفتی اعظم، تو کسی کے لیے نمونۂ اسلاف، خطیبِ زماں، طوطیِ ہند، محققِ دوراں، علامۃ العصر، فقیہِ زماں، جامعِ علوم عقلیہ ونقلیہ، شیخ المشائخ، مفکرِ اسلام، رازیِ وقت، غزالیِ دوراں، شہنشاہِ خطابت، محقق علی الاطلاق، قطبِ لاریب، محدثِ اعظم، ثانیِ جنیدؒ، مونسِ ہند وغیرہ وغیرہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں امانت داری کا ذرا بھی خیال نہیں، اور سوچتے ہیں کہ الفاظ اور جملوں کی بے اعتدالیوں پر کہاں سر قلم ہونے والا ہے؟

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ بعض حضرات تو باقاعدہ اپنے حلقۂ احباب کو اس طرح بڑے بڑے القاب کا لاحقہ یا سابقہ اپنے نام کے ساتھ لگانے کی تاکید کرتے ہیں، اور القاب کے بغیر پکارے جانے پر بے التفاتی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں؛ جب کہ احادیث شریفہ میں جہاں تعریف میں مبالغہ آرائی سے روکا گیا ہے، وہیں افراط پسند افراد کو افراط سے باز رہنے کی تاکید بھی کی۔ اس حوالے سے چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

۱۔إذا رأیتم المدّاحین فاحثوا فی وجوہہم التراب۔ترجمہ: جب تم تعریف میں مبالغہ کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے چہروں پر مٹی ڈال دو۔(مسند احمد:5/6)

۲۔خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذاتِ اقدس کے متعلق ارشاد فرمایا: لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ۔۔۔۔۔ترجمہ: لوگو! میری تعریف میں مبالغہ سے کام نہیں لینا، جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ بن مریم کے متعلق مبالغہ آرائی کی تھی۔

۳۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: سمع النبی ﷺ یثنی علی رجل ویطریه فی مدحه، فقال: أهلكتم أو قطعتم ظهر الرجل۔(صحیح بخاری، کتاب الشہادات)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے شخص کی خوب بڑھا چڑھا کر تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: ”تم نے اس شخص کو ہلاک کر دیا“ یا فرمایا کہ ”تم نے اس کی کمر توڑ دی“۔

۴۔حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا: إیاکم و التمادح فانه الذبح۔(سنن ابن ماجہ: ۳۷۴۳) ”کسی کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے بچو؛ اس لیے کہ ایسا کرنا اسے ذبح کرنے کے مثل ہے۔

۵۔ایک اور روایت میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنی لا أرید أن ترفعونی فوق منزلتی

التی أنزلنیہا اللہ تبارک و تعالیٰ ۔(مسند أحمد 153/3) میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ مجھے میرے اس مقام سے اوپر اٹھادو جس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے رکھا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک سلسلۂ گفتگو میں بعض مخترع القاب کے متعلق فرمایا: ''خبر نہیں لوگ کس عبث اور فضولیات میں مبتلا ہیں، اس سے ان لوگوں کے مذاق کا پتہ چلتا ہے، کوئی شیخ الحدیث ہے، کوئی استاذ الحدیث، کوئی شیخ التفسیر، کوئی شیخ الجامعہ، یہ اس قسم کے جھگڑے ابھی شروع ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں میں تو ان چیزوں کا نام ونشان بھی نہ تھا، یہ سب جاہ طلبی ہے۔اور سب سے زیادہ اچھی اور خوبی کی بات تو وہی ہے جو پہلے اپنے بزرگوں میں تھی: سادگی، اسی میں برکت ہے، ان چیزوں میں برکت کہاں، یہ سب نئی روشنی کا اثر ہے۔(ملفوظ نمبر: ۷۲۴، ۳/۷۲، ملفوظات حکیم الامت)

تعریف میں مبالغہ آرائی کے نقصانات

تعریف میں غلو، ممدوح کے کبر وغرور میں مبتلا ہونے، خود فریبی کا شکار ہونے، اور دوسروں کو دھوکہ دینے کا سبب ہے، اس سے تمرد وسرکشی کی خو، ممدوح میں سر ابھارنے لگتی ہے، جو اس کی اخلاقی وروحانی موت کا یقیناً پیش خیمہ ہے۔اس لئے اب عوام بلکہ اہل علم کے لئے بھی ضروری ہے کہ نہ تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیں کہ تعریف کسی کی انا وخود پرستی کی غذا بن جائے اور نہ تعریف کرنے میں اتنی بخالت کریں کہ ہمیشہ دوسروں کے عیوب ہی پر نظر ہو؛ بلکہ اعتدال کے دامن کو ہر حال میں تھامے رکھیں۔اللہ عمل کی توفیق دے، آمین۔

ایک عظیم اصلاحی ودعوتی تحریک کا نام ہے۔آپ بھی اس میں شریک ہوجایئے اور اپنے دوست واحباب کو بھی اس کے پڑھنے کی ترغیب دیجئے۔جزاکم اللہ تعالیٰ

یہ ماہنامہ www.iauth.in پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

اصلاحی مضامین

روحانی انفیکشن اور روحانی اینٹی بایوٹک

مولانا محمد اللہ قیصر قاسمی

آج بچے کے ساتھ ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا تھا، ڈاکٹر نے حالات دریافت کرنے کے بعد نسخہ لکھنا شروع کیا، دوا تجویز کرنے کے بعد ہدایت دی کہ اینٹی بایوٹیک کو پابندی سے لینے پر خصوصی توجہ دیں، متعینہ اوقات میں چوک کی کوئی گنجائش نہیں، اگر چھوٹ گیا تو ازسرنو دوا لینی ہوگی۔

مطلب یہ تھا کہ ناغہ ہونے کی صورت میں کمزور ہوتا ہوا بیکٹیریا، اپنی سابقہ حالت میں پہونچ کر مضبوط تر ہوجاتا ہے، بلکہ اس میں اینٹی بایوٹک سے لڑنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔

میں کچھ دیر سوچنے لگا کہ کیا روح بھی انفیکٹیڈ ہوتی ہے؟، جس کا سسٹم بعض گناہوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اوراس کے لیے بھی کوئی انٹی بایوٹک ہے جیسے توبہ، استغفار، نماز وغیرہ جیسے اینٹی بایوٹک تجویز کیے گئے ہیں؟ سوال ہے کیا اگر انسان استغفار میں ناغہ کرتا ہے، تو روحانی انفیکشن بھی قوی تر ہوجاتا ہے؟

روح کا انفیکشن کیا ہے؟: قرآن میں ہے "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" بلکہ ان کے کرتوت نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کردیا ہے۔

اس کے علاوہ مختلف احادیث ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں سے قلب سیاہ ہوجاتا ہے،" إذا أذنب العبدُ نُكِتَ في قلبِهِ نُكتةٌ سوداءُ" بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس کو مادی تعبیر میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ روح انفیکٹیڈ ہوجاتی ہے، ذرا تفصیل سے اس طرح سمجھیں کہ جس طرح ہمارا جسمانی ڈھانچہ جن ظاہری اور پوشیدہ اعضاء و جوارح پر مشتمل ہے، ان سے ہم واقف ہیں، اگر کوئی اینٹی جن/بیکٹریا/ جرثومہ اس میں داخل ہوتا ہے تو ہمارا جسم ردعمل ظاہر کرتا ہے، جو عموماً بخار، سردی، نزلہ، کھانسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، پھر اینٹی بایوٹک لیتے ہیں، تو انفیکشن ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد جسم کے تمام اعضاء درست طریقہ سے اپنا کام شروع کردیتے ہیں، اسی طرح ممکن ہے کہ روح بھی انفیکٹیڈ ہوتی ہو، (اس کے اعضاء و جوارح ہیں یا نہیں اس کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں، کیوں کہ روح کی تفصیل اللہ نے نہیں بتائی) اور وہ روح

مخالف اعمال (معاصی) کے ظہور سے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوں، یا یوں کہیں کہ جس طرح، خارجی مخالف جسم (اینٹی جین) کے دخول سے جسم میں انفیکشن ہوتا ہے اسی طرح روح مخالف عمل کے ظہور سے روح میں انفیکشن ہوتا ہے، اوران کا اثر قساوت قلبی، توفیق سے محرومی، معاصی میں بیباکی، علم ورزق میں تنگی، وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، انہیں کو ہم روحانی بیماری بھی کہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ روحانی بیماریوں کا علاج بھی روحانی ہوگا، (جس طرح جسم مادی ہے تو اس کو لاحق ہونے والی بیماریوں کا علاج مادی اشیاء کا مرکب ہوتا ہے) ان روحانی علاجات کو روحانی اینٹی بایوٹک سمجھ لیں، جیسے حدیث پاک میں ہے" إنَّ هذهِ القلوبَ تَصدأُ كما يَصدأُ الحديدُ إذا أصابهُ الماءُ. قيلَ وما جِلاؤُها؟ قالَ: كثرةُ ذِكْرِ الموتِ وتلاوةِ القرآنِ، دلوں پر ایسے زنگ لگ جاتے ہیں، جیسے پانی لگ جانے سے لوہا زنگ آلود ہوجاتا ہے، پوچھا گیا: اس کی صفائی کیسے ہوگی؟ فرمایا: کثرت سے موت کا ذکر اور قرآن کی تلاوت سے (زنگ دور جاتا ہے) نماز کے متعلق قرآن نے کیا" إن الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنكر " بلاشبہ نماز برائیوں سے روکتی ہے، اگر تم اجتناب کرتے رہو گے ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا جارہا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی برائیوں کو تم سے دور کردیں گے اور تمہیں داخل کریں گے بہت باعزت جگہ پر۔

جس طرح صحیح سالم جسم میں موجود انفیکشن مادی اینٹی بایوٹک سے دور ہوتا ہے، اسی طرح روح کا انفیکشن روحانی اینٹی بایوٹک، اور روحانی علاج سے دور گا، اور روح کے لیے اینٹی بایوٹک ہے، توبہ، استغفار، تلاوت، اور دیگر اعمال صالحہ۔

واضح رہے کہ توبہ استغفار کو اینٹی بایوٹک سے تشبیہ دی گئی صرف سمجھانے کے لیے، ایک جسم کی بیماری دور کرتی ہے تو دوسری روح کے امراض سے نجات کا سبب بنتی ہے، ورنہ ظاہر ہے اینٹی بایوٹک جو کہ ایک مادی علاج ہے چونکہ انسانوں کی بنائی ہوئی ہے لہذا وہ انفیکشن دور کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سارے نقصانات بھی پہنچاتی ہے، یعنی مفید بیکٹیریا اور مضر بیکٹیریا میں فرق نہیں کرتی اور دونوں کو ختم کرتی ہے، اس سے جو نقصانات ہوتے ہیں انہیں ہی سائڈ افیکٹ کہا جاتا ہے۔ جبکہ توبہ واستغفار کی بڑی فضیلت ہے، ان سے مومن کا مقام بلند ہوتا ہے، قرب الٰہی کی نعمت ملتی ہے، اگر دل سے کیا جائے تو وہ روح کو بالکل پاک کردیتے ہیں، اس کا کوئی سائڈ افیکٹ نہیں ہوتا، جیسے اینٹی بایوٹک کے ہوتے ہیں، البتہ بسا اوقات انسان خود اپنی کمزوری کی بنا پر ان اعمال صالحہ نافعہ کو اپنے لئے نقصان کا سبب بنالیتا ہے، مثلاً اس میں عجب، ریا، نام ونمود پیدا ہوجائے، تو یہ الگ بات ہے، لیکن استغفار بذات خود فوائد کا مجموعہ ہے، روحانی ترقی کا زینہ ہے۔

اصلاحی مضامین

ماہ رجب کی مذہبی وتاریخی اہمیت

از: مفتی محمد ظل الرحمن قاسمی*

اسلامی سال کے بارہ مہینے اپنے اندر کوئی نہ کوئی تاریخی اہمیت ضرور رکھتے ہیں۔اسی طرح ان بارہ مہینوں پر مشتمل سال کی بھی ایک اہمیت ہے۔قرآن کریم نے بارہ ماہ کے سال کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا ہے: ترجمہ: یعنی یقیناً (ایک سال کے) مہینوں کی تعداد بارہ اللہ کی کتاب (لوح محفوظ) میں ہے (اور یہ اس وقت سے مقرر ہے) جب اللہ نے آسمان وزمین کو بنایا۔ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سال کے بارہ مہینوں میں سے چار (ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب) کی حرمت و عظمت بیان کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے تاریخی خطاب میں ارشاد فرمایا تھا کہ: ''زمانہ لوٹ کر اپنی جگہ واپس آ گیا اور اب مہینوں کی ترتیب وہی ہوگئی ہے، جو اللہ نے تخلیق ارض وسماء کے وقت مقرر کی تھی۔

رجب کی عظمت وحرمت کے سارے عرب قائل تھے۔مگر اسلام نے اس ماہ مبارک کی فضیلت بعض تاریخی واقعات کی بنا پر اور بڑھا دی۔لغت کی کتابوں میں رجب کے معنی ''عظمت و بزرگی'' کے بیان ہوئے ہیں اور ترجیب بمعنی تعظیم آیا ہے۔زمانہ جاہلیت میں اس ماہ کی تعظیم کے پیش نظر اس میں جدال وقتال منع تھا۔قبیلہ مضر کے لوگ بطور خاص اس ماہ کی تعظیم کرتے اور قتل وغارت گری کو اس ماہ میں انتہائی معیوب جانتے تھے۔اس لئے لغت کی بعض کتابوں میں رجب کو رجبِ مضر بھی کہا گیا ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں اسے رجبِ مضر ہی فرمایا ہے۔

رجب میں قربانی:

رجب کے مہینے میں زمانہ جاہلیت میں قربانی کرنے کا رواج بھی تھا اور یہ قربانی عتیرہ اور رجبیہ کہلاتی تھی۔اسلام میں اس قربانی کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا۔چنانچہ سنن ترمذی میں ایک روایت اس طرح ملتی ہے کہ حضرت ابوذر بن لقیط بن عامر عقیلیؓ کہتے ہیں میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم زمانہ جاہلیت میں رجب کے مہینے میں قربانی کیا کرتے تھے، جسے ہم خود بھی کھاتے اور جو کوئی ہمارے پاس آتا

اسے بھی کھلاتے تھے۔ حضور ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ رجب کی قربانی بتوں کے تقرب کے لئے کرتے تھے' اس لئے حضور ﷺ نے اس سے ایک موقع پر منع بھی فرمایا مگر اس ممانعت کا مقصد دراصل بتوں کے لئے ذبح کرنے سے منع کرنا تھا نہ کہ مطلقاً رجب میں ذبیحہ سے منع کرنا۔

اہل اسلام کے لئے ہر ماہ میں اللہ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر ذبح کرنے کی اجازت ہے۔ بعض علماء نے اسے مباح کہا ہے بلکہ بعض علماء تو رجب میں باقاعدگی سے ''رجبی'' کرتے تھے جس کی صورت یہ ہوتی کہ جانور ذبح کیا جاتا اور دعوت عام ہوتی۔ جب کہ ملا علی قاریؒ اور علامہ عینیؒ نے رجب کی قربانی کو ممنوع قرار دیا ہے۔

قریش کے یہاں ماہ رجب میں قتال کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا' اس لئے جب غزوہ بدر سے قبل نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ماہ رجب میں ایک سریہ کے لئے صحابہ کو روانہ فرمایا اور انہوں نے بطن نخلہ میں قریش کے ایک قافلہ کو پایا جو عراق کی طرف جا رہا تھا تو اس پر حملہ کرنے میں انہیں تردد ہوا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر حملہ کرتے تو رجب کی تعظیم وحرمت کے پیش نظر یہ مناسب نہ تھا اور حملہ نہ کرتے تو اگلے ہی روز قافلہ حدود حرم میں داخل ہو جاتا پھر تو حملہ کرنا اور بھی نامناسب ہوتا۔ چنانچہ صحابہؓ نے کثرت رائے سے فیصلہ کر کے حملہ کر دیا؛ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ قافلہ کا سامان تو مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا لیکن کفار کو یہ شور مچانے کا موقع مل گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے حرمت والے مہینوں کی حرمت و وقار کا بھی خیال نہیں کیا۔ نبی اکرم ﷺ کو علم ہوا تو آپ بھی صحابہؓ کے اس عمل سے ناخوش ہوئے؛ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی تسکین قلب اور صحابہؓ کی دلجوئی وعزت افزائی فرماتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائیں: ترجمہ: وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا کیا حکم ہے، آپ فرمایئے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روک دینا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روک دینا) اور اس میں بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بڑے گناہ ہیں اور فتنہ وفساد قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشہر حرام اور رجب کی فضیلت کو اسلام نے خاص اہمیت دی ہے۔

رجب میں عمرہ:

ماہ رجب میں عمرہ کا رواج زمانہ جاہلیت میں پایا جاتا تھا اور پورا عرب ماہ رجب میں عمرہ کرنے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ پورے جزیرہ عرب سے ماہ رجب میں وفود مکہ مکرمہ کا رخ کرتے تھے اور ان قافلوں کو راستے میں کسی قسم کی لوٹ مار یا قتل وغارت گری کا خوف نہ ہوتا جبکہ دیگر مہینوں (ماسوا اشہر حرام) میں یہ ضمانت نہیں ہوتی

تھی۔عربوں کے ہاں ایک رواج یہ بھی تھا کہ ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم میں کاروباری منڈیاں قائم کی جاتیں اور حرم کے اردگرد بڑے بڑے تجارتی میلے لگا کرتے۔ان مہینوں میں عمرہ نہیں کیا جاتا تھا؛ بلکہ عمرہ کے لئے رجب ہی کا مہینہ مقرر تھا اور اشہرِ حج میں عمرہ کرنا عربوں کے ہاں افجر الفجور سمجھا جاتا تھا۔

بعض مسلمانوں میں رجب کے مہینے میں عمرہ کو بہت افضل سمجھا جاتا ہے' حالانکہ عمرہ ادا کرنا سنت ہے اور یہ کسی بھی مہینے میں کیا جاسکتا ہے اور رجب بھی کیا جائے گا اس کی فضیلت ایک سی ہوگی ماسوا ماہ رمضان کہ اس کے بارے میں ارشاد مصطفوی بڑا واضح ہے: ''رمضان المبارک میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے' یا میرے ساتھ حج کے برابر ہے''۔

ماہ رجب اور معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

اگرچہ اس بات میں اختلاف ہے کہ واقعہ معراج کب اور کس ماہ میں پیش آیا۔اور اس سلسلہ میں علماء سلف کے متعدد اقوال ہیں۔کسی نے ربیع الاول' کسی نے ربیع الثانی اور کسی نے رمضان المبارک کا مہینہ قرار دیا ہے۔ تاہم اکابر علماء کی ایک جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ رجب ہی کے مہینے میں پیش آیا۔

واقعۂ معراج کے حوالے سے ۲۷/رجب اہل اسلام کے ہاں عبادات کی راتوں میں ایک رات شمار کی جاتی ہے، اسی رات لوگ بکثرت نوافل ادا کرتے اور ذکرواذکار کرتے ہیں، مکہ مکرمہ میں علماء حرم کے منع کرنے کے باوجود حرم شریف عمرہ کرنے والوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔(اگرچہ محققین کے نزدیک اس سلسلے میں کوئی مخصوص عبادت اجتماعی یا انفرادی ثابت نہیں ہے) میرے قیامِ مکہ مکرمہ 1983-1980ء کے دوران ایک بار امام حرم نے ماہ رجب کے ایک جمعہ کے خطاب میں کہا کہ لوگ خواہ مخواہ رجب کی 27 ویں شب میں عمرہ کو افضل سمجھ کر حرم میں رش (بھیڑ بھاڑ) کر دیتے ہیں حالانکہ اس رات میں عمرہ کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔اگلے ہی روز صبح حرم میں بعد نماز عصر جناب علامہ محمد علوی مالکی نے درس دیتے ہوئے اس کی پرزور تردید کی اور کہا ''لوگوں کو اس رات میں عمرہ کرنے سے یہ کہہ کر روکنا کہ اس رات کی کوئی فضیلت نہیں' بہت بڑی غلطی ہے' سوال یہ ہے کہ عبادات کی کثرت عنداللہ پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ؟ اگر ناپسندیدہ ہو تو بےشک منع کیجئے؛ لیکن اگر مطلوب ہو تو کرنے دیجئے کہ اس بہانے کچھ لوگ عبادت کے لئے وقت نکال لیں گے، البتہ اسے ضروری اور مسنون نہ سمجھا جائے۔نیز یہ کہ ہر وہ دن افضل ہے جس دن کی نسبت محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور ہر وہ رات افضل ہے جس کو کسی بھی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت ہے''۔

ماہ رجب میں پیش آنے والے چند اہم تاریخی واقعات:

تاریخ اسلام میں ماہ رجب میں متعدد تاریخی واقعات پیش آنے کا ذکر ہے ان میں سے ایک ہجرت حبشہ اولیٰ ہے، جب مسلمان اہل مکہ کی سختیاں برداشت کرنے سے عاجز آکر باذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عازم حبشہ ہوئے۔ اس قافلہ میں باختلاف روایات 12 مرد اور 4 عورتیں تھیں، سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قافلہ سالار مہاجرین تھے۔ یہ سن پانچ نبوی کا واقعہ ہے۔

☆ سریہ عبداللہ بن جحش الاسدی اسی ماہ رجب میں ہجرت مدینہ سے کوئی 17 ماہ بعد پیش آیا جس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ یہ وہ سریہ ہے جس نے اسلامی تاریخ میں نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں، مثلاً اسلامی تاریخ کا پہلا مال غنیمت، پہلا خمس، پہلا شہید اور پہلا قیدی اس سریہ نے پیش کیا۔

☆ 9 ہجری میں پیش آنے والا عظیم غزوہ، غزوہ تبوک بھی ماہ رجب ہی میں پیش آیا تھا جسے غزوہ ذات العسرہ کا نام دیا گیا۔ یہی وہ غزوہ ہے جس میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا گھر بار خالی کر کے تن من دھن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف ایک بار پھر حاصل کیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تہائی لشکر کا ساز و سامان اپنی گرہ سے پیش کر کے جنت کا پروانہ اور یہ سند حاصل کی: ترجمہ: (آج کے بعد عثمان کچھ بھی کریں انہیں کوئی نقصان نہ ہوگا)

☆ حبشہ کے مسلمان بادشاہ نجاشی کا انتقال 9 ہجری ماہ رجب میں ہوا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازخود اطلاع پا کر اپنے صحابہ کی معیت میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔

☆ دمشق کی تاریخی فتح 14 ہجری سن 635ء عیسوی میں ماہ رجب ہی میں ہوئی۔ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو ربیع الثانی 14 ہجرت سے دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، فتح یاب ہوئے اور اہل دمشق نے صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

☆ سلطان صلاح الدین ایوبی نے 583ھ، 1187ء میں رجب ہی کے مہینے میں فتح بیت المقدس کے بعد مسلمانوں کے ہمراہ مسجد اقصیٰ میں فاتحانہ داخل ہو کر عاجزانہ سجدہ شکر ادا کرنے کا شرف حاصل کیا۔

اس طرح ماہ رجب کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے جو اس کی مذہبی فضیلت (شہر حرام) ہونے کے علاوہ ہے۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی*

کیا بغیر عقیقہ کے مرنے والا بچہ سفارشی ہوگا؟

سوال: اگر کوئی بچہ بغیر عقیقہ کے فوت ہوجائے تو کیا مرنے کے بعد اس کی طرف سے عقیقہ کرنا ضروری ہے؟ نیز کل قیامت کے دن وہ بچہ ماں باپ کا سفارشی ہوگا؟

جواب: عقیقہ کرنا صرف زندگی میں مستحب ومسنون ہے، واجب اور لازم نہیں ہے، اور بچہ کے انتقال کے بعد یہ مستحب ومسنون بھی نہیں رہتا؛ اس لئے کہ عقیقہ صرف زندہ کی طرف سے ہوتا ہے، مردے کی طرف سے نہیں ہوتا۔ اور اس بچہ کی موت پر ماں باپ نے صبر کیا ہے تو ان شاء اللہ، یہ بچہ ماں باپ کے لئے سفارشی بنے گا۔ (مستفاد از: فتاوی قاسمیہ ۲/ ۳۸)

کئی نکاحوں کے لئے ایک خطبہ

سوال: کیا کئی نکاحوں کے لئے ایک خطبہ کافی ہے؟

جواب: اگر متعدد نکاح ایک مجلس میں کرنے کا پروگرام ہو تو ان سب کے لئے ایک ہی خطبہ کافی ہے، ہر نکاح کے لئے الگ الگ خطبہ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ (کتاب المسائل ۴/ ۸۳)

لڑکی سے نکاح کی اجازت لینے کون جائے؟

سوال: لڑکی سے نکاح کی اجازت لینے کے لئے کن رشتہ داروں کو جانا چاہئے؟

جواب: نکاح میں لڑکی سے اجازت لینے کے لئے صرف انہیں رشتہ داروں کو جانا چاہئے جو لڑکی کے محرم ہوں، نامحرم رشتہ داروں کو اجازت کے لئے جانا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس سے بے پردگی ہوتی ہے۔ (اگرچہ کہ وکالت واجازت درست ہوجاتی ہے) (کتاب المسائل ۴/ ۹۹)

منہ بولے بھائی بہن کا آپس میں نکاح

سوال: کیا منہ بولے بھائی، بہن کا آپس میں نکاح درست ہے یا نہیں؟

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

جواب: اگر کسی مرد نے کسی عورت کو منہ زبانی اپنی بہن بنالیا، یا عورت نے کسی مرد کو منہ بولا بھائی بنالیا تو اس سے حرمت نہیں آتی، نکاح میں ایسے رشتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے (کتاب المسائل ۴/۱۶۱)

مہر فاطمی اور اس کی مقدار

سوال: مہر فاطمی کسے کہتے ہے، اور موجودہ زمانہ میں اس کی مقدار کیا ہوگی؟

جواب: "مہر فاطمی" اس مہر کو کہا جاتا ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاتونِ جنت سیدتنا فاطمہؓ اور دیگر صاحب زادیوں، اور ازواجِ مطہراتؓ کا مقرر فرمایا تھا۔ اس کی مقدار ۵۰۰ درھم چاندی ہے، جس کا وزن موجودہ حساب سے ۱/کلو ۵۳۰/گرام ۹۰۰/ملی گرام ہوتا ہے۔ (کتاب المسائل ۴/۲۹۱)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سن کر انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر لگانا

سوال: اذان میں جب مؤذن" اشھد ان لا الہ الا اللہ " کہتا ہے تو سامعین اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں پر رکھتے ہیں، تو کیا یہ عمل جائز ہے؟

جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامِ نامی سننے پر انگوٹھوں کو چومنا اور آنکھوں سے لگانا سنت نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا اور نہ صحابہ کرامؓ سے یہ عمل ثابت ہے، ہاں" مسند فردوس دیلمی" سے ایک روایت اس کے متعلق نقل کی گئی ہے، وہ روایت ضعیف ہے، بعض بزرگوں نے اس عمل کو آنکھیں نہ دکھنے کے لیے مؤثر بتایا ہے، تو اگر کوئی شخص اس کو سنت نہ سمجھے اور آنکھوں کے نہ دکھنے کے لیے بہ طور ایک علاج کے عمل کرے تو اس کے لیے فی نفسہ یہ عمل مباح ہوگا، مگر لوگ اس کو شرعی چیز اور سنت سمجھ کر کرتے ہیں؛ اس لیے اس کو ترک کر دینا ہی بہتر ہے؛ تا کہ لوگ التباس میں مبتلا نہ ہوں۔" (کفایت المفتی، ج:۲ ص:۱۱۶)

دورانِ نماز جیب سے موبائل نکال کر بند کرنا

سوال: اگر کسی شخص نے نماز کے دوران جیب سے موبائل نکال کر نمبر دیکھ کر اس کا سوئچ آف کر دیا، تو کیا اس کی نماز اس عمل کی وجہ سے فاسد ہو جائے گی؟

جواب: جیب سے باقاعدہ موبائل نکال کر سوئچ بند کرنے کا عمل مفسدِ صلوۃ ہے؛ کیوں کہ اسے دیکھ کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص نماز میں نہیں ہے، ایسے عمل کو فقہی اصطلاح میں "عملِ کثیر" کہتے ہیں جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ (کتاب النوازل ۳/۱۶۶)